حیاتِ امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ

تالیف جانباز مرزا

ناشر	خالد سعید جانباز
پبلشر	مکتبہ تبصرہ لاہور
طابع	چٹان پریس لاہور
کتابت	مقصود احمد
تعداد	ایک ہزار

محکمہ تعلیم مغربی پاکستان سے سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

نمبر سی ڈی / ایجوکیشن / ۱۲ — ۲۸ / ۶۷

مورخہ ۷ / جنوری ۱۹۷۰ء

قیمت : ۱۰۰ / روپیہ

اُس عظیم ماں کے نام

جس کی کوکھ نے ایشیا میں ایک ایسے
سپوت کو جنم دیا، جس کی للکار سے برطانوی
سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گُل ہو گیا

فہرست

باب سوم

۱۹۶۹ء میں جب پہلی بار "حیاتِ امیرِ شریعت" منظرِ عام پر آئی - تو مجھے یقین نہیں تھا کہ لوگ میری طرزِ تحریر کو پسند کریں گے۔ اس پر بھی شاہ جی (رحمۃ اللہ علیہ) کے عقیدت مندوں نے کتاب ہذا کو ہاتھوں ہاتھ خرید لیا - آخر جب نکہتِ بادِ بہاری کا صحنِ چمن سے گذر ہوا تو گل بوٹوں سمیت باغ کی ہر شاخِ گُل فضا سے مہک اٹھی - پتّے پتّے کی زبان پر بہارِ نو کا تذکرہ تھا - صیّاد بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا اور خزاں نے بھی بادلِ نخواستہ مسکراتی نظروں سے دیکھا -

مجھ سے پیشتر متعدد دانشوروں نے امیرِ شریعتؒ کی سوانح حیات پر قلم اٹھایا - مگر ؎

نہ ہوا ، پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ ! یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

الحمدللہ کہ خونِ جگر کی آمیزش سے میں نے جو اشکِ پیازی کیے تھے وہی لالہ و گل کے چہرے کا غازہ قرار دیے گئے اور اس طرح "حیاتِ امیرِ شریعت" کو عوام میں خاص اہمیت حاصل ہوئی -

جنوری ۱۹۷۰ء کو پاکستان کے محکمہ تعلیم نے "حیاتِ امیرِ شریعت" کو کالج اور سکولوں کی لائبریریوں کے لیے منظور کر لیا تو کتاب نئی نسل کے مطالعہ میں آئی - اس سے پیشتر اساتذہ سے طلبا تک کے دل اور ذہن حیاتِ امیرِ شریعت سے بیگانہ تھے - وہ اس مردِ درویش کی آپ بیتی کو اجنبی سمجھتے رہے جس نے برصغیر کی آزادی کے لیے نصف صدی غیر ملکی سامراج سے لڑائی لڑی اور اس جُرم کی پاداش میں اسے جیل خانوں سے دار و رسن تک پہنچنا پڑا - جیسے جیسے وہ کتاب کے اوراق پلٹتے گئے حقیقت نکھر کر سامنے آتی گئی ___ اور قارئین کا ذوقِ تجسس بڑھتا گیا - لیکن کتاب بازار میں ختم ہو چکی تھی -

قریباً چھ سال گزرنے پر حالات نے ذرا سنبھالا لیا اور اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو حیاتِ امیرِ شریعت کا باتصویر ایڈیشن جو پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت، کتابت کی غلطیوں سے پاک قارئین کے سامنے ہے اس پر بھی اگر کہیں بھول محسوس ہو تو بلا حجاب مطلع کریں تاکہ اس پر آئندہ غور ہو سکے -

والسلام :- آپ کا جانباز مرزا

مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۷۶ء

ابتدایہ

سنہ ۱۹۳۰ء کا زمانہ ہندوستان میں اُن سیاسی سرگرمیوں کے عروج کا سال تھا جو آگے چل کر غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف پُر امن بغاوت کے حالات کو جنم دینے کا باعث بنیں اس سے پہلے سنہ ۱۹۲۹ء کے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کے جلو میں دریائے راوی کے کنارے آل انڈیا کانگرس نے برطانوی سامراج سے مکمل مکتی خلاصی کے لئے اپنی تاریخی قرارداد منظور کی۔ ورنہ پیشتر ازیں درجہ نوآبادیات کی خواہش تک تمام جدوجہد مرکوز تھی، شہید اشفاق اللہ بسمل کا یہ شعر اُس دَور کی نشاندہی کرتا ہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لئے شاخ میری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کے بعد مہاتما گاندھی کی قیادت میں غیر ملکی حکومت کے خلاف حصولِ آزادی کے لئے برصغیر کی یہ دوسری بڑی تحریکوں کی تیاری تھی غلاموں کے جذبات اُبھر کر بغاوت کے موڑ پر آن پہنچے تھے۔ ہندوستان کا ہر مرکزی شہر اس تحریک کا کیمپ قرار دیا جا چکا تھا، یہ نمکین ستیہ گرہ کی تحریک تھی۔ اِسی سلسلہ میں،

گوجرانوالہ میں مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں ستیہ گرہ کانفرنس منعقد ہوئی، ان دِنوں میری عمر اٹھارہ اُنیس سال کے آس پاس تھی۔ گو غلام دیس کے نوجوان کے لیے زندگی کا یہ سن عقل و شعور سے عاری ہوتا ہے، تاہم فرنگی حکمرانوں کے خلاف میرے جذبات اس سال جوان اور بالغ ہو چکے تھے۔ اور انہیں تمناؤں کے سہارے مَیں امرتسر سے پیدل گوجرانوالہ پہنچا۔

اس کانفرنس کا آخری اجلاس تھا کہ سرِ شام پنڈال میں خاص قسم کی ہماہمی، چہروں پر رونق، دِلوں میں مسرتوں کا طوفان موجزن تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کیلئے آئے۔

خوبصورت خد و خال کے ساتھ سُرخ و سپید چہرے پر سیاہ داڑھی، گٹھیلا جسم، بُوٹا سا قد، نیم آستین والا گاڑھے کا کرتہ، ٹخنوں سے اُونچا شرعی قسم کا کھدر کا پاجامہ سر پر گول دیوبند طرز کی ٹوپی، پاؤں میں دیسی ساخت کا چپل، یہ تھے سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

پنڈال سے باہر کثیر ہجوم نے ان کا استقبال کیا، گوجرانوالہ کی زمین نے اُن کے قدم چُومے، آسمان نے بلائیں لیں، فضاؤں نے بہاروں کی بارش کر دی عوام کی نگاہیں فرشِ راہ ہوئیں، دِل و دماغ نے ہم آہنگ ہو کر ہندوستان کے بہادر سپُوت کا خیر مقدم کیا، وہ جیسے جیسے اپنی قیام گاہ کے قریب پہنچتے گئے، چاند۔ تاروں کا ہجوم اُن کی رہنمائی کرتا رہا۔ مَیں اُس اچھوت کی طرح جسے مندر کے دروازے پر کھڑے بھگوان کی مُورتی دیکھنے کی اجازت تو ہے لیکن قریب جا کر اُن کے چرن نہیں چھُو سکتا، دُور سے شاہ جی کو دیکھتا رہا۔

یہ تھی حضرت امیرِ شریعتؒ سے میری پہلی ملاقات!

"وے ایہہ کالا کلوٹرا کتھوں نے آندا ای حاجی؟"

۶۱

(یہ کالا سیاہ کہاں سے لے آئے عاجز!)

"اسے کالا لڑے گا، تے آپے ای پتہ لگ جائے گا"

(یہ کالا جب ڈسے گا تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔)

امرتسر ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں بیٹھے خواجہ عبدالرحیم عاجز اور حضرت امیرِ شریعتؒ کے درمیان میرے متعلق یہ مختصر گفت گو تھی۔

مولانا عبدالرحمٰن نکودری کا سالانہ اجتماع تھا، یہ حضرات اس میں شمولیت کے لیے نکودر ضلع جالندھر جا رہے تھے۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ میں حضرت امیرِ شریعتؒ کو قریب سے دیکھ رہا تھا، اِس سفر میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے بھی ملنے کا موقعہ ملا ــــــ چار دن کی یہ ہمراہی زندگی بھر کا ساتھ بن گئی۔

اخلاص و محبت کا پیکر، زندہ دلی کا مجسمہ، مسکراہٹوں کا انبار، انجمنِ ہزار داستان جب وہ حلقۂ احباب میں رونق افروز ہوا، تو میرے مستقبل کی ساری کائنات اُس کے تابع ہو کر رہ گئی۔ اِس طرح دِلوں سے ہفتے، مہینے اور سال گزرنے لگے۔ پھر جفائیں بھی گواہ ہیں کہ وفاؤں میں کبھی دراڑ نہیں آئی۔ اِن راستوں میں پھول اور کانٹے ایک ساتھ ملے، اندھیرے اُجالوں سے بھی گذر ہوا، تو ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں چھوٹا جیل اور ریل کے طویل سفر مشترک اثاثہ حیات بنتے رہے۔ مقاصد کی ہم آہنگی نے اِن واقعات پر سے تیس سال گزار دیے۔

اِس وادیٔ پُر خار سے جب پہلے پہل میرا گزر ہوا، تو بچپنا جوانی کی اِبتدائی سرحدوں پر چھوڑ کر جا چکا تھا، اور اگست ۱۹۶۱ء میں حضرت امیرِ شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) جب اس جہان سے رخصت ہوئے، تو میرا قدم بڑھاپے کی دہلیز پر تھا۔ حالات کی

ایک لمبی لکیر گزار کر جب رہنما کے بغیر مقاصدِ حیات کی راہوں سے گزرنا پڑا، تو اس بازار میں میرا قلم میرے ساتھ تھا۔ یہ ستمبر ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے کہ حضرت امیرِ شریعتؒ کی سوانح حیات تاریخ کے دامن میں محفوظ کرنے کی سعی کی۔

یہ دستاویز مکمل کرنے میں آٹھ سال بیت گئے، تلاش و تجسس، حقائق و واقعات میں کن لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے پڑے، یہ کہانی اس قدر طویل ہے کہ اس کے لیے پھر ایک کہانی کی ضرورت ہے۔

ستمبر ۱۹۶۱ء میں جب کتاب ہذا کا آغاز کیا، اور بہت سی منزلیں طے کر لیں تو فروری ۱۹۶۲ء میں دفتر تحفظ ختم نبوت لاہور سے تمام مسودہ چوری کر لیا گیا۔

سیپ ایک دفعہ موتی اُگلنے کے بعد بازیچۂ اطفال بن جاتا ہے۔ اسی طرح قلم سے ایک بار نکلی ہوئی عبارت اگر ضائع ہو جائے، تو دوبارہ اس میں وہ جان نہیں آتی۔ مسوّدہ کیا کھویا، میرا دل کھو گیا۔ ہارے ہوئے جواریے کی طرح بیکار ہو کر بیٹھ گیا، خیالات کی مجتمع عمارت ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ عزم و ارادے کی پامالی چور کو دعائیں دینے لگی۔ اس طرح ایک سال بیت گیا، کہ میرے عزیز دوست ملک محمد رفیق مالک مکتبہ "ادبستان" جب روزنامہ "کوہستان" لاہور کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے تو انہیں اپنے پرانے دھندے کو از سرِ نو شروع کرنے کا خیال آیا، اور انہوں نے مجھے حضرت امیرِ شریعتؒ کی سوانح حیات مرتب کرنے کی دعوت دی، جسے میں نے بغیر کسی کاروباری معاہدے کے قبول کر لیا۔ گری ہوئی عمارت کی نیو پھر سے اُٹھانی پڑی، اور میں تاریخ کے اوراق کھنگالنے میں مصروف ہو گیا۔

قریباً دو سو صفحات کی کتابت ہو چکی تھی کہ اچانک ایک روز ملک محمد رفیق نے

معذرت کے ساتھ کتاب کی اشاعتی ذمہ داریوں سے انکار کردیا، اس کے لیے انہوں نے خانگی پریشانیوں کا عذر تراشا۔ حقیقت اور افسانے کے درمیان کس قدر فاصلہ ہے، یہ اندازہ میں نہیں کرسکا، بہر حال مسودہ پوری ہونے کے بعد یہ دوسرا موڑ آیا کہ بحیثیت مصنف مجھے پھر مایوسی اور نامرادی کا سامنا کرنا پڑا۔

جاسوسی اور دوسرے فحاشی لٹریچر کی بہتات نے صاف ذہنوں کے مصنفین اور پبلشرز کو اپنی راہوں سے دور کردیا ہے، اور اس پر کاغذ کی گرانی کوہ ہمالیہ سے کہیں زیادہ بوجھل ہو کر گری ہے، جس کے نتیجے میں پاکستان میں ایسی کتب کا فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ جس کی انسانیت کو خواہش ہے۔

ایسے وقت میں رفیق ملک کا "حیات امیر شریعتؒ" کی اشاعت سے انکار میرے ارادوں کی موت کے ہم وزن تھا، لیکن اس لاش پر ماتم کرنے کی بجائے میں نے کشتی کو اپنے آنسوؤں کے طوفان میں چھوڑ دیا، اور کناروں کی تلاش میں ایک پتوار کے سہارے چلتا رہا، اور اکثر دفعہ ساحل پر پہنچ کر بھی مایوسی ہوئی۔

اقتدارِ زر انسان کے دل و دماغ پر جب قابض ہو جاتا ہے تو اصولِ آدمیت ریت کے گھروندے کی طرح گر جاتے ہیں۔ میں نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے ایسے دروازوں پر دستک دی، جہاں دولت کی فراوانی سے انسان ابلیس کے بھی پر کترتا ہے، لیکن میری صدا، صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اور انہیں دنوں

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو میرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہَوا دینے لگے

یہ آگ پھر ایسی بھڑکی کہ سارا گھر جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

انہیں حالات میں آٹھ برس گزر گئے، اور اُس مردِ درویش کی کہانی جس نے برِصغیر کے کروڑوں انسانوں کی کہانی کو جِلا بخشی تھی، بے رنگ و روغن پڑی رہی، آخر بہار آئی اور نخلِ نومیدی سے ایسے پھول نکلے، کہ بے آب و گیاہ سرزمین کے کانٹوں نے لالہ زار کو شرمندہ کر دیا۔

یہ درست ہے کہ اکثر دانشوروں نے حضرت امیرِ شریعتؒ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ملک بھر کے اخبارات و رسائل نے اُن کی سیاسی اور مذہبی زندگی پر قلم اُٹھایا۔ تاہم اُن کی مکمل زندگی کے ادھورے نقش مستقبل کے مؤرخ کو بیحد مایوس کرتے رہے۔

برطانیہ ایسی سلطنت کے پرخچے اور دھجیاں بکھیرنے والے اِنسان کی زندگی کے حالات و واقعات کو اُس کی بعض طبعی کمزوریوں تک محدود کر دینا اُس کی کروڑوں خوبیوں سے ناانصافی ہے۔ اگرچہ زندگی میں اُس کے سیاسی اور مذہبی حریفوں نے اُس کے راستے میں کانٹے بکھیرے، اور اُس کی راہیں مسدود کرنے سے گریز نہیں کیا، تو بعد از مرگ دوست نما دشمنوں نے بھی کمی نہیں کی۔

لاریب کتاب ہذا میں مجھ سے امیرِ شریعتؒ کی تمام زندگی کا احاطہ نہیں ہو سکا اُن کی داستانِ حیات صحراؤں سے صحنِ چمن تک بکھری پڑی ہے، بُلبُل سے کرگسوں تک کو اُن کی کہانی یاد ہے، شمشیر و سناں کے تیز دھاروں سے چل کر غزل کے مطلع و مقطع تک کے اصول و ضوابط ان سے آشنا ہیں۔ ایسے اِنسان کی کہانی کاغذ کے دامن میں کیوں کر محیط ہو سکتی ہے۔ اور پھر ماضیٔ قریب کے معماروں نے اِس راہ کے تمام مسافروں کے نقوش اِس بُری طرح مٹاتے ہیں کہ بادِ سموم کو بھی

ہدایت کردی کہ ایسے کسی نشان کو باقی نہ رہنے دے جس سے ماضی کے واقعات نمایاں ہو سکیں۔ ایسے میں حقیقت اور افسانے کے مابین امتیاز کے لیے جن دُور رس نگاہوں کی ضرورت تھی، میرا وجود ہمیشہ اُس سے تہی رہا۔ اِس کے باوجود امیرِ شریعتؒ کی بہتر سالہ زندگی کے تاریک اور روشن پہلو اُجاگر کرنے میں میری عمر کے آٹھ برس صرف ہوئے ہیں۔ اِس راستے میں مَیں نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اُس کی نشاندہی کے لیے مَیں قارئین کا ممنون ہوں گا، تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح ہو سکے۔

یہ حقیقت ہے، کہ کتاب ہذا کی ترتیب میں میری یادداشتوں نے میرا بڑی حد تک ساتھ دیا۔ تاہم مَیں اُن مصنفوں کا شکر گزار ہوں جن کی تصانیف نے میری اکثر رہنمائی کی۔

ان میں ——————

"رئیس الاحرار" ——— کے مصنف مولانا عزیز الرحمٰن لدھیانوی

"تحریک مدحِ صحابہ" ——— کے مصنف مولانا مظہر علی اظہر

"مارشل لاء سے مارشل لاء تک" ۔۔ کے مصنف سید نور احمد

"رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات ۱۹۵۳ء" } ۔ از مسٹر جسٹس محمد منیر
مسٹر جسٹس ایم، آر کیانی

(جانباز مرزا)
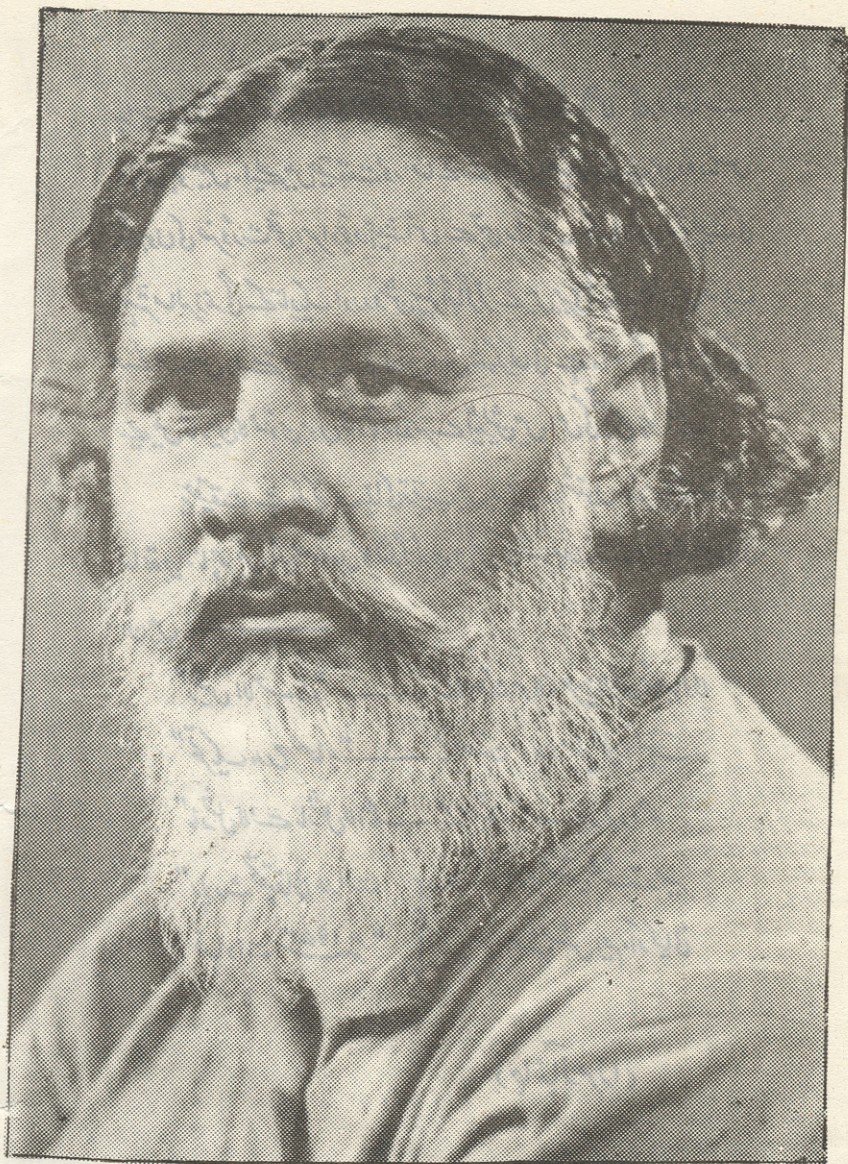
غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

امیرِ شریعت ۱۹۳۰ء کی ایک یادگار تصویر۔ ح

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا

۱۹۴۲ء کے تاریخی مقدمہ کے تین اہم کردار

سر سکندر حیات خاں وزیر اعلیٰ پنجاب   چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ مسٹر ڈگلس ینگ

سرکاری رپورٹر مسٹر لدھارام

امیر شریعت ۱۹۴۲ء میں اپنے تاریخی مقدمہ سے رہائی کے بعد ۱۱ کورٹ
سے باہر تشریف لا رہے ہیں۔

اثاثۂ حیات
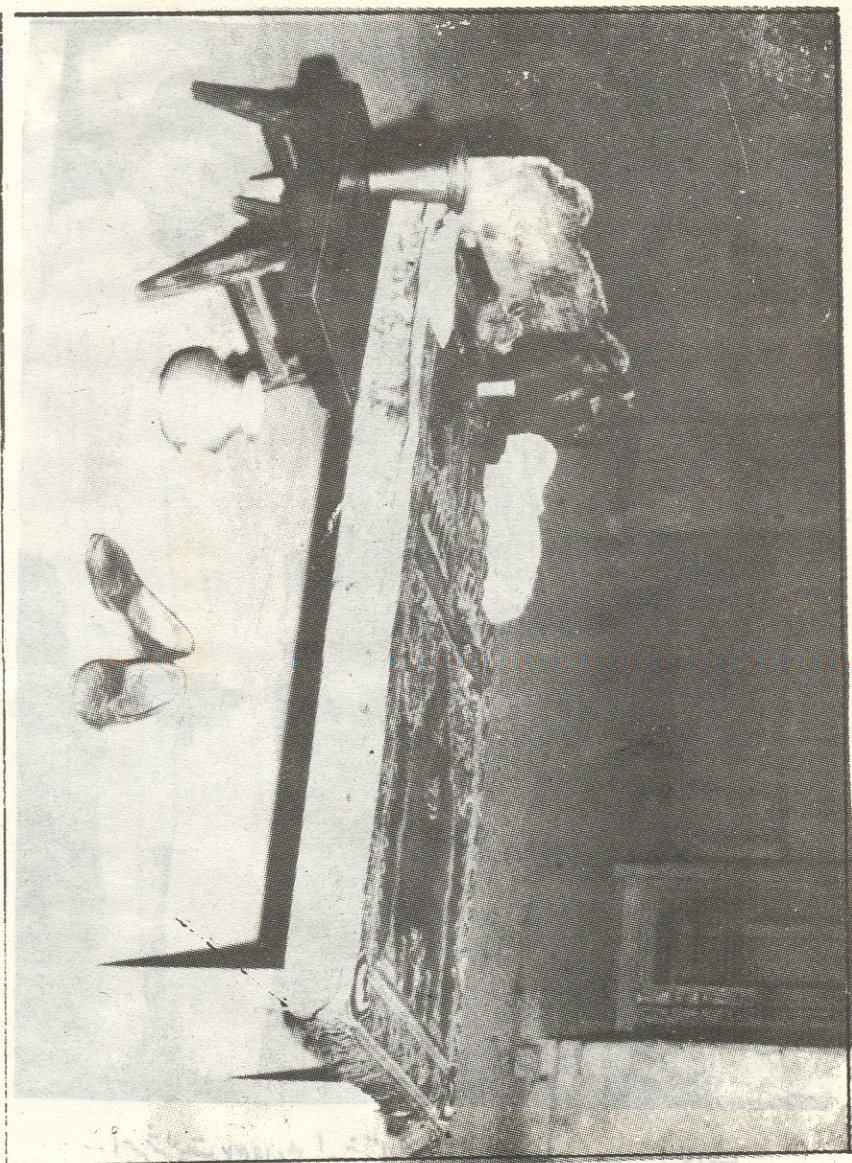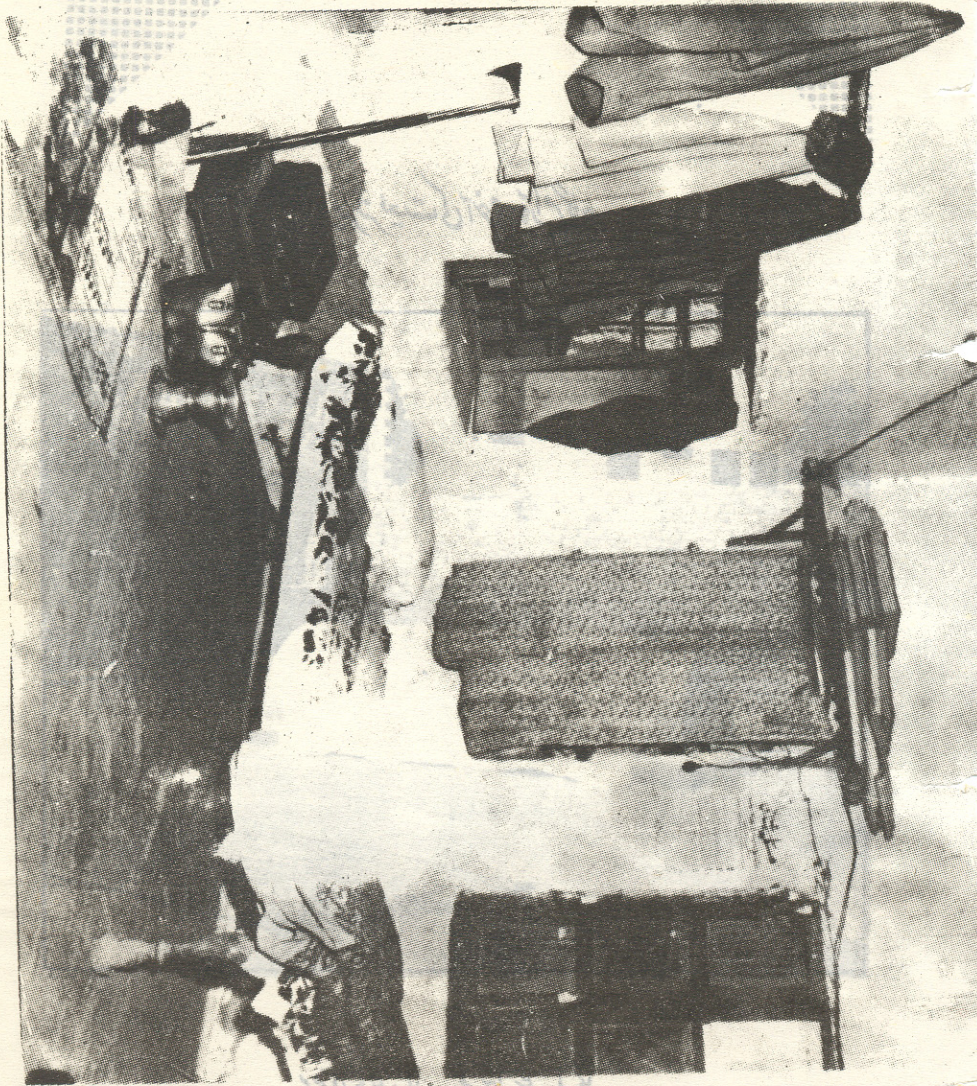
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

مصنّف

امیر شریعت کی آخری آرام گاہ

برمزار ما غریباں نے چراغ نے گلے

باسمہ تعالیٰ

باب اوّل ـــــ ۱۸۹۱ تا ۱۹۲۱ء
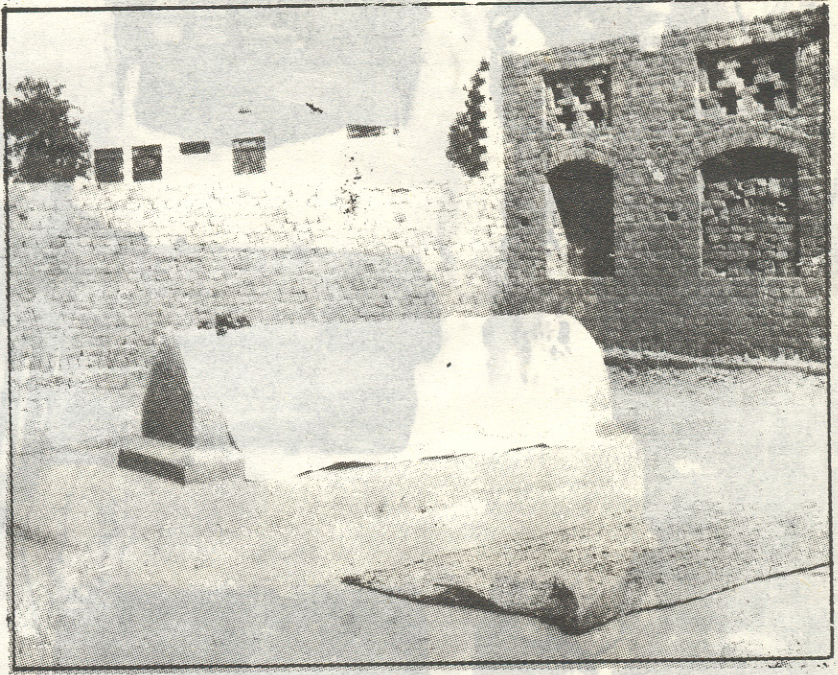
امیرِ شریعت رح

خالق کی ہر تخلیق میں کوئی نہ کوئی مصلحت کارفرما ہوتی ہے۔ انسانی وجود ہو یا حیوانی ڈھانچہ نگارِ خانۂ فطرت کے یہ حسین شاہکار کائنات کے لیل ونہار میں آرائش کیے ہوئے ہیں۔

ایک اگر نسیم سحری اور بادِ سموم کے درمیان پنکھ پھیلا کر اپنی زندگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو دوسرا فکرِ معاش، عشقِ بتاں اور غمِ روزگار کے تارِ عنکبوت میں الجھا ہوا ہے اور یہی اس کی زندگی ہے موت دونوں کی منزل ہے۔ کچھ فاصلے پر چل کر دونوں دم توڑ دیں گے۔ زندگی دونوں سے وفا نہیں کرتی۔ لیکن حواسِ خمسہ کی سرحدوں سے آگے دونوں کی ذمّہ داریاں تقسیم ہو جاتی ہیں۔

اگر انسان کا ضمیر زندہ ہے اور اس کا آئینہ فطرت ٹوٹ نہیں گیا، تو لحد سے مہد تک کی تمام ذمّہ داریوں کی تصویر صاف دکھائی دے گی۔ اِسے اپنے راستے کے پھول اور کانٹوں میں کوئی الجھاؤ نظر نہیں آئے گا۔ وہ مستقبل پر اپنے کفِ پا موجود پائے گا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایسے ہی زندہ جاوید لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ آرائش کائنات میں ایسے چراغ کی طرح روشن رہے جس کی لَو میں آسمان کے ستاروں نے اپنی راہیں تلاش کیں اور گم کردہ راہ انسانوں نے انہیں راہِ انسانیت کا سنگِ میل جانا۔

وہ حرّیت و مساوات کی جنسِ گراں بار اٹھائے زندگی کے بازاروں میں ربع صدی تک لوگوں کو ہر موڑ پر بلاتے رہے۔ انہوں نے گورستانوں میں برسوں اذانیں دیں لیکن غلام رگوں کے منجمد خون کو اپنی گرم گفتاری سے حرکت میں نہ لا سکے۔

اگر وہ پہاڑوں کو پکارتے تو شاید وہ خاکِ راہ بن کر اُن کے دامن سے لپٹ جاتے۔ اگر

ستاروں کو آواز دیتے تو یقیناً وہ اپنی قندیلیں زمین کے حوالے کر دیتے ۔ مگر آہ! بخاری نے ان درواز وں پر دستک دی جن کے دل خون سے تہی، آنکھیں بینائی سے محروم اور کان صدائے حق سے ناآشنا تھے۔

فرنگی قمار خانوں کی دیواروں پر کھڑے ہو کر اس نے حجازی لَے میں وہ گیت چھیڑا کہ صراحی و جام ٹکرا کر رہ گئے اور ساقی اپنے حواس کھو بیٹھا۔ وہ ایک ایسا قافلہ سالار تھا کہ راستے کا گرد و غبار بھی اس کی منزل اوجھل نہ کر سکا۔ وہ اپنے پیچھے جو نقش پا کر گیا ہے، مستقبل کے مسافروں کے لیے ان میں کئی منزلیں پوشیدہ ہیں۔

زندگی اور موت کے درمیان جب تک کشمکش جاری ہے، نظامِ کائنات جب تک متحرک ہے، زمین اور آسمان کے درمیان جب تک بہار و خزاں کی آمد و رفت جاری و ساری ہے سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

سال ۱۸۹۱ء کے بیل و نہار پر فرنگی حکمرانوں کی جلوہ آفرینیاں ہنوز جنم لے رہی تھیں ہندوستان کے در و دیوار ۱۸۵۷ء کے غیر ملکی تشدّد کی صدائے باز گشت سے کبھی کبھار کپکپی محسوس کرنے لگتے تھے۔ غلامی کی زنجیریں سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ ہندوستان کا بخت اقتدار فرنگی کے روبرو نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

وقت نے ہمیشہ بخت کا ساتھ دیا ہے۔ زمانہ شاہی عروج کے جلو میں چلنے کا عادی ہے۔ غلام ہندوستان سے وقت اور بخت دونوں روٹھ چکے تھے۔ مغلیہ سلطنت کے آفتاب کو غروب ہوئے ۳۴ برس بیت چکے تھے کہ پٹنہ ضلع بہار کی سرزمین پر ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ (مطابق ۱۸۹۱ء) چاند رات جمعہ کے دن نور کے تڑکے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ اور ننہال کی جانب سے شرف الدّین احمد رکھا گیا۔

خدا کے سوا اس راز سے کون آشنا تھا کہ آج ایک ماں اپنی کوکھ سے جس بچے کو جنم دے رہی ہے وہ خون اور گوشت کا لوتھڑا نہیں بلکہ مستقبل کے ہندوستان کی پیشانی کا ایک جھومر ہے جس کی روشنی سے حکمرانوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی اور دنیائے انسانیت میں وہ وقت

کا عظیم خطیب ہوگا۔

سیاسی لحاظ سے ۱۹۸۱ء کا سال بڑا اہم سال تھا۔ اس سن میں بعض اور لوگ بھی عدم سے وجود میں آئے، جنھوں نے آگے چل کر تاریخ آدمیت کو اپنے خون سے جلا بخشی۔ جنون شوق سے عقل وخرد کی راہیں ہموار کیں تاکہ آنے والوں کے لیے راستے کے نشیب وفراز پر ان کا ہر نقش پاسنگِ میل بن کر رہ جائے۔

اس سلسلے میں یوگوسلاویہ کے صدر جوزف بروز ٹیٹو، فرانس کے جنرل چارلس ڈیگال، جاپان کے شاہی خاندان کے شہزادہ گینوئی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نظامِ فطرت کی بوقلمونیاں دیکھئے کہ ایک ہی وقت، ایک ہی موسم اور ایک ہی سال میں ماں کی کوکھ سے دھرتی کی پیٹھ پر آنے والے یہ چاروں بچے کائنات کے بناؤ سنگار میں کس طرح مصروف رہے۔

آخرالذکر یورپ میں پیدا ہوئے۔ راج سنگاسن پر بیٹھ کر لوگوں پر حکومت کرتے رہے لیکن اوّل الذکر نے ایشیا کی گود میں جنم لے کر عوام کے دلوں پر حکمرانی کی۔

گھرانا

تاریخ جن لوگوں کو اپنی تکمیل کے لیے منتخب کرتی ہے۔ لازم نہیں کہ ان کی نسبت کسی اونچے اور اعلیٰ خاندان سے ہو۔ بلکہ ماضی بعید میں جن لوگوں نے تاریخ کے صفحات پر اپنے نقش چھوڑے ان کے آباؤ اجداد کو وقت کے حاکمانہ وقار نے کبھی نظر التفات سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ لیکن جھونپڑیوں میں پرورش پانے والوں نے جب محلّات پر کمندیں ڈالیں تو شاہی تاج ان کے قدم چومنے لگا۔ اور فرماں روائی ان کی عبائیں اٹھائے پھری۔ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا جو روحانی دنیا میں رشد وہدایت کا صدیوں محور رہا۔ انسانی زیست نے فخر ومباہات کے سینکڑوں صنم خانے ویران کر کے انہی مے خانوں سے اپنی آنکھوں کے ڈورے سرخ کیے۔ ان کے لڑکھڑاتے قدم انہیں آشنائے مراد تک لے آئے۔ یہیں سے انسانیت اپنی منزل کے لیے سفر شروع کرتی ہے۔

اس صدی کے مشہور کشمیری مؤرخ منشی محمد الدین فوق اپنی تصنیف "تاریخ کشمیر" کے دوسرے حصہ میں رقم طراز ہیں کہ :-

"حضرت امام حسن مجتبیٰ کی چوبیسویں اور حضرت سید محی الدین عبد القادر جیلانی رح کی تیرھویں پشت سے ایک بزرگ سید عبد الغفار بخاری المشہور قاضی خانقاہی بخارا سے اپنے والد سید محمد بخاری کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے۔ یہ اسلامی حکومت کا زمانہ تھا۔ عہدہ درس وقضا پر فائز ہوئے۔ سرینگر میں اب بھی آپ کی قبر مزار بڈہ شاہ رح میں دیوار سے متصل شمال کی جانب موجود ہے۔

سید عبد الغفار رح کی اولاد کشمیر کے علاوہ پنجاب کے اضلاع گجرات اور امرتسر میں اکثر پھیلی اور اب بھی موجود ہے۔ انہی کی اولاد سے ساتویں پشت میں سید عبد الرسول رح جو کہ سید رحمت اللہ کے بیٹے تھے ایک خدا رسیدہ بزرگ گزرے ہیں۔ ان کا تقویٰ یہاں تک تھا کہ مرغی کا انڈہ اور مرغ صرف اس لیے نہیں کھاتے تھے کہ یہ دانہ دنکا لوگوں کے گھروں میں بھی جا کر کھالیا کرتے ہیں۔ اسی زمانے میں شاہ عبد الرحمان (جو رحمان شاہ کے نام سے ایک مشہور مجذوب گزرے ہیں) کے اشارے سے سید عبد الرسول نے اپنے دونوں بیٹوں سید حضور اللہ اور سید ولی اللہ کو دستکاری اور عوام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔"

اس سلسلے میں آگے چل کر تاریخ اقوام کشمیر کے مصنف شجرہ نسب کو یوں ترتیب دیتے ہیں۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ

سید محمد بخاری (چوبیسویں پشت)　　حضرت محی الدین سید عبد القادر جیلانی رح

تیرھویں پشت

سید عبد الغفار بخاری

چوتھی پشت

سید عطا اللہ شاہ اول

سید عبدالرسول کے والد سید رحمت اللہ کے دوسرے بھائی کا نام سید نعمت اللہ تھا۔ رحمت اللہ اور نعمت اللہ کے والد سید عطاء اللہ شاہ اول حضرت سید عبدالغفار بخاری کی چوتھی پشت سے ہیں۔

سید عبدالرسول کے چچا سید نعمت اللہ کے چار فرزند تھے جن میں سے سید عبداللہ اور سید ضیاءالدین لاولد تھے۔ تیسرے لڑکے سید بہاؤالدین تھے۔ جن کے چار بیٹے تھے۔ ان کے دو بیٹوں سید محمد شاہ اور سید امان اللہ کے ہاں اولاد تھی۔

سید امان اللہ کے چھ بیٹے ہیں، جن میں دو اولادِ نرینہ سے محروم رہے۔ چار اولادِ نرینہ سے سرفراز کیے گئے۔ سید محمد شاہ کے پانچ لڑکے تھے۔ سید پیر شاہ لاولد تھے اور سید حسام الدّین کے ہاں عمر بھر اولاد نہ ہوئی، باقی تین صاحب اولاد تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سید نور شاہ کے پوتے اور سید ضیاءالدین کے فرزند تھے۔

اس طرح سے یہ خاندان اب تک پاکستان کے اکثر علاقوں میں پھل پھول رہا ہے۔ لوگ انہیں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ننھیال لاریب آدمی کا سلسلۂ نسب ددھیال سے شروع ہوتا ہے، لیکن عالی نسب ہونے کے لیے اس قدر سند ادھوری معلوم ہوتی ہے۔

ماں کی کوکھ میں اولاد بھی تبھی صالح پرورش پائے گی، جب ماں کا اپنا خون شریف النفس والدین کی بنیاد پر ہوگا۔ ورنہ یک طرفہ نیکی کے نتائج اکثر غیر صالح رہے ہیں۔

بلاشبہ سید عطاء اللہ شاہ کی عالی نسبی جس کے باعث ان کے دُدھیال کی قبائے زندگی ہمیشہ روشن رہی، قدرے ادھوری معلوم ہوتی اگر اس میں ننھیال کا پیوند برابر کا نہ ہوتا۔ چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ کی والدہ محترمہ سیّدہ فاطمہ اندرابی بنت مولانا حکیم حافظ سید احمد اندرابی کا نسب نامہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کو روحانی دنیا میں بلند مقام حاصل ہے۔ ان کی نواسی سیّد عطاء اللہ کی نانی اماں تھیں۔

سید ضیاءُ الدّین ہنوز غیر ملکی اقتدار کا سورج طلوع ہوئے چند ساعتیں گزری تھیں ابھی حالاتؔ نے وفا کے دامن کو گرہ نہیں دی تھی، دلوں کے تالے چابی کھو جانے پر بھی زنگ آلود نہیں ہوئے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ کے والد سید ضیاء الدین اپنے تایا سید پیر شاہ صاحب بخاری اور چچا حافظ سید حیدر شاہ صاحب بخاریؒ کے ساتھ پشمینے کی سوداگری کرنے اپنے گاؤں ناگڑیاں ضلع گجرات سے بہار کے مشہور شہر پٹنہ میں اکثر جایا کرتے تھے۔

ان دنوں یا اٹھارہ انیس سال کے پیٹے میں تھے۔ انہیں قرآن کریم پڑھنے اور سنانے کا اس قدر شوق تھا کہ ایک دفعہ محلہ چوک بازار (پٹنہ) میں ملک عنبر کی مسجد میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں شبینہ کے روز نمازِ عشاء کے وقت پتہ چلا کہ آج تین حافظ باہم مل کر قرآن کریم ختم کریں گے تو غصہ میں کہا

"یہ کیا حرکت ہے، ایک ہی آدمی کو قرآن کریم ختم کرنا چاہیے"؟

اس پر دوسرے حافظ نے طنزاً کہا "تو پھر یہ کام آپ ہی کریں"۔

"بہت اچھا"! یہ کہہ کر مسجد سے چلے آئے۔

گھر آئے تو چہرے پر "تغیر" کے آثار دیکھ کر سید حیدر شاہ نے فرمایا۔

"کیا بات ہے حافظ جی۔؟ کچھ کھوئے کھوئے سے دکھائی دیتے ہو"

اس پر مسجد کا سارا واقعہ کہہ دیا۔ حیدر شاہؒ نے فرمایا۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اللہ کا نام لے کر شروع کر دینا"

چنانچہ رات جب قرآن کریم پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو پہلی رکعت میں چھبیس پارے ختم کر دیے۔ اسی طرح مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دادا مولانا محمد رحمت اللہ کا بیان ہے کہ:۔

"۱۸۵۷ء کے بعد ایک مدت میں نے پٹنہ (گنگا کے کنارے) مسجد میں گزاری ان دنوں حافظ ضیاء الدین کی عمر انتیس سال تھی، اور انہوں نے ایک رات مجھے ایک ہی رکعت میں سارا قرآن کریم سنا دیا تھا"

شادی نیک سیدوں کا یہ خاندان ایک عرصہ پٹنہ میں رہ کر اس قدر مقبول ہوا کہ نہ صرف کاروبار میں برکت اور رحمت ہوئی، دنیوی قرابت داری کی خواہشیں بھی پروان چڑھنے لگیں۔ پٹنہ کے متمول اور دین دار صاحب فکر حکیم حافظ سید احمد اندرابی نے جن سے اکثر خاندانی تعلقات استوار ہو چکے تھے اپنی دختر نیک اختر حضرت حافظہ سیدہ فاطمہ اندرابی کی شادی

حافظ سید ضیاالدین سے کر دی۔

فاطمہ اندرابی ۱۸۵۷ء میں فرنگی سامراج کے ہاتھوں دلی کا جو سہاگ اُجڑا اگر جمنا کی لہریں آج تاریخ کے اوراق اگل دیں اور لال قلعے کی دیواریں ان خونی حادثات کی گوکشائی کریں تو ماضی کی ایک ایک لکیر ابھر کر سامنے آجائے۔ شرافت اور تمدّن کی برہنہ لاشیں دہلی کی شاہراہوں پر شرم و حیا کی بھیک مانگ رہی تھیں، آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی عمارات غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم و جور میں رنگ بھر رہی تھیں، گلیاں اور بازار خاندانوں کے لیے خاناں ہونے پر ماتم کناں تھے۔

اس پُرآشوب دور میں اُجڑے ہوئے گھروں میں ایک گھرانا حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی نواسی کا بھی تھا، جو دہلی سے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں جا کر آباد ہوا۔ سیدہ فاطمہ اندرابی ؒ اسی گھر کی نیک سیرت بیٹی تھیں۔

والدہ کی وفات انسانی ارادے دلوں میں جنم لیتے ہیں، ذہنوں میں پرورش پاتے ہیں اور عمل کی دنیا میں اکثر و بیشتر مات کھا جاتے ہیں۔ یہیں سے قدرت اور انسان کے درمیان حدِ فاصل قائم ہوتی ہے۔ اگر عزمِ انسانی کائنات کی تسخیر کے نقشے سوچتا ہے تو خالقِ کائنات ہر نقشے کو نقشِ فریادی بنا دیتے ہیں کہ آدمی کے تصورات کا ہیولیٰ پانی پانی ہو کر رہ جاتا ہے۔ والدین اولاد کے مستقبل کے لیے جو خاکے ترتیب دیتے ہیں۔ کبھی تو وہ ریت کے گھروندے ثابت ہوتے ہیں اور کبھی ان پر تاجِ شاہی کے گل بوٹے کھلتے ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ؒ بچپن کی چوتھی بہاریں سے گزر رہے تھے کہ ان کی والدہ محترمہ کو داعئ اجل کا پیام آگیا اور وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ گو آغوشِ پدری میں ماں کا پیار جلوہ فگن نہیں تھا تاہم شفقتِ والد نے انہیں اس احساس سے دور رکھا۔

بغیر ماں کے بچے کی زندگی اس پتے کی طرح ہوتی ہے جو شاخ سے ٹوٹ کر کبھی تو بادِ سموم کی جھولی میں جا گرتا ہے اور کبھی نسیمِ سحرگاہی اسے اپنے پالنے میں سنبھال لیتی ہے

تاہم شاخ سے محروم زندگی تلخ کامیوں میں بسر ہوتی ہے۔

بن ماں کے بچہ باپ کی تربیت کے سہارے پروان چڑھنے لگا۔ ۱۸۵۷ء کی صدائے بازگشت سے کبھی کبھار فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا لیکن شاد عظیم آبادی کے نغمے فضا کا رُخ موڑ دیتے۔ ان دنوں پٹنہ میں حضرت شاد عظیم آبادی کا چراغ جل رہا تھا۔ شعروادب کی ساری رونقیں ان کے وجود کے گرد سمٹ کر رہ گئی تھیں۔

سید علی محمد شاد جو آگے چل کر شاد عظیم آبادی کے نام سے معروف ہوئے جنوری ۱۸۴۶ء کو پٹنہ کے محلہ پورب دروازہ میں پیدا ہوئے اور جنوری ۱۹۲۷ء کو انتقال کر گئے۔

محلہ پورب دروازہ، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے محلہ کے برابر میں تھا۔ پڑوسی اور سیّد ہونے کے باعث شاد عظیم آبادی کا بچپن اکثر شاہ جی کی نانی اماں کے ہاں گزرتا۔ پٹنہ میں یہ گھرانا بھی علم و ادب کا مرکز تھا۱؎ یہ شاد عظیم آبادی نے بھی اس صحبت سے کافی فیض پایا۔ چنانچہ زبان کی نوک پلک اور شعر کہنے کا سلیقہ اسی گھر کا مرہونِ منّت ہے۔

شاد عظیم آبادی کی عمر اور شاعری اپنی جوانی کی سرحدیں عبور کر چکی تھیں کہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو جھولنے سے نکال کر ان کی گود میں ڈال دیا اور مستقبل کا خطیبِ اعظم وقت کے عظیم شاعر کی جھولی میں شعروادب کے کھلونوں سے کھیلنے لگا۔

بچپن بچہ خواہ انسان کا ہو یا حیوان کا عادات و خصائل میں ترازو کے ایک ہی تول تلتا ہے۔ امتیازِ جنس دوسری بات ہے مگر شوخی دونوں کے خمیر میں ایک سی ہے۔ شرارت دونوں کی گھٹی میں ہے اور پھر جو بچہ یتیم ہو، عزیز و اقارب کا پیار اس کے بگاڑ میں خاصا معاون ہوتا ہے۔

والدہ کی موت کے بعد شاہ جیؒ کو ماں کا پیار اور ان کی ذمہ داریاں صرف والد کے پیار میں تلاش کرنی پڑیں۔ چنانچہ باپ نے فرزند کے گرد پیار و محبت کا ایک ایسا حصار تعمیر کیا جس میں علم دین کی تکمیل ہو سکے۔ یہ دور تھا کہ اس میں انگریزی تعلیم مذہب سے لگاؤ رکھنے

قرائت

جنونِ شوق اگر خرد کا پاسبان ہو تو ناخنِ تدبیر دل کی گرہ کشائی میں رہنمائی کرتے ہیں۔ شاہ جی کو کتاب اللہ وراثت میں ملی تھی۔ ننہال کا گھرانا دینِ مبین سے ناآشنا نہیں تھا۔ والدہ محترمہ قرآن کی حافظہ، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سینہ بھی اس خزینے سے مالامال تو پھر بیٹا اس دولت سے کیوں کر تہی دامن رہ سکتا تھا۔ دو سال میں قرآن کریم ازبر کرلیا۔ خود شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"میں اکثر فجر اور ظہر کے درمیان قرآن کریم ختم کرلیا کرتا تھا"

ان دنوں شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) اٹھارہ سال کے پیٹے میں تھے۔ محمد عمر عاصم نامی کویت کا ایک شخص جو سلطان عبدالحمید والیٔ ترکیہ کے بچوں کو قرآن کریم پڑھانے پر مامور تھا۔ سلطان کی اس سے قدرے ناراضگی ہوگئی اور وہ ترکیہ چھوڑ کر ہندوستان کی سیاحت کے لیے نکل آیا۔ سیر و تفریح کے دوران جب وہ پٹنہ آیا تو یہاں کی آب و ہوا نے اسے متاثر کیا اور ایک مدت وہ یہیں رہا۔ قدرت نے اس کے گلے میں رس اور آواز میں سوز عنایت کیا تھا۔ وہ جب کبھی موج میں آکر قرآن کریم پڑھتا تو غیر مسلم بھی مسجد کے گرد جمع ہو جاتے۔

شاہ جی کو اخذِ فن میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ اکثر محمد عمر عاصم کے لہجہ میں قرآن کریم پڑھتے اور پھر گھر میں اس کی مشق کرتے۔ چنانچہ ایک دن شاہ جی قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے کہ محمد عمر عاصم کا گزر اس راستے سے ہوا تو وہ شاہ جی کی آواز اور اپنا ہی لہجہ سن کر بہت متاثر ہوا۔ اسی شام محمد عمر عاصم نے حضرت شاہ جی کے والد سے درخواست کی کہ آپ اس بچے کو میرے پاس بھیج دیا کریں۔

فنِ قرأت میں عربی زبان کے تلفظ اور آواز کے زیر و بم کو ایک ساتھ چلنا ہوتا ہے لیکن اکثر قاری قرأت کے سفر پر ایک کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ شاہ جی کو فنِ قرأت کی یہ معراج حاصل رہی کہ قرآن کریم تلاوت کرتے وقت اِن راہوں سے عزم و احتیاط سے گزرتے۔ حجازی لَے میں ان کے گلے کی حلاوت ان کا پورا ساتھ دیتی اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ قرآن کریم پڑھتے

تو یوں معلوم دیتا ہے جیسے آسمان سے ابھی نازل ہو رہا ہے۔ چنانچہ اکثر واقعات ہیں کہ غیر مسلم ان کے جلسے میں صرف قرآن حکیم سننے جایا کرتے تھے۔ اسی طرح کئی خاندان مسلمان ہوئے۔

امرتسر میں

سال ۱۹۱۲ء یورپ اور ایشیائی قوموں کی ہلاکت آفرینیوں کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ بنی نوع انسان کی تباہی کے نشانات اُبھر رہے تھے۔ یورپ کے سیاسی دانشوروں کے غلط فیصلوں نے براعظم کو مرگ و زیست کے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ جرمنی اور برطانیہ کی جنگ ایک تہذیب اور ضرورت کی لڑائی تھی۔ آگ اور موت کے اس کھیل میں برطانوی استعمار ایشیا کو استعمال کرنے کے نقشے بنا چکا تھا۔ غلام قوموں کے مردہ ضمیر پر کھڑے ہو کر پہلی جنگ عظیم لڑنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ شاہ جیؒ والد صاحب کی اجازت لیے بغیر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

سر پر بھاری قسم کی ریشمی سبز پگڑی، ریشمی اچکن، تنگ پائینچے کی شلوار اور بہاری طرز کی سرخ رنگ کی جوتی پہنے چھوٹا سا لوہے کا ٹرنک اٹھائے دن کے چار بجے ہال بازار امرتسر میں سید اسد اللہ شاہ بخاری کی دکان پر پہنچے۔ یہ بزرگ شاہ جی کے قرابت داروں میں سے تھے۔ ان دنوں شاہ جی کی عمر قریباً اکیس برس کے پیٹے میں تھی۔

"میرا نام عطاء اللہ ہے۔ میں حافظ ضیاء الدین کا بیٹا ہوں اور پٹنہ سے ان کی اجازت کے بغیر آیا ہوں۔"

اس سفر کی کہانی شاہ جی یوں بیان کرتے ہیں۔

"میں گھر سے نکل کر کچھ مدت بنارس چھتے والی مسجد کے زیر سایہ میاں شکر اللہ کے پاس ٹھہرا۔ یہ صاحب چاندی کے ورق کوٹنے کا دھندا کرتے تھے اور پہلوانی بھی۔ ان کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ میں نے ورزش کرنی اور ڈنٹر پیلنے شروع کر دیے۔ یہ سلسلہ کافی دنوں جاری رہا۔"

میر اسد اللہ بخاری کے برادر نسبتی سید پیر شاہ بخاری جو رشتہ میں شاہ جی کے والد کے چچا

تھے، انہیں دینی تعلیم کے لیے حضرت مولانا مفتی غلام مصطفٰے کے ہاں چھوڑ آئے مفتی غلام مصطفٰے
ان دنوں کٹڑا کمہاراں کی مسجد کے خطیب اور مدرسہ نصرت الحق میں مدرس تھے۔ ان کا شمار اپنے
علم اور تقویٰ کے اعتبار سے اس دور کے ممتاز علماء میں تھا۔

شاہ جی نے ۱۹۱۴ء تک اس درس گاہ میں "صرف و نحو" اور فقہ کی کتابوں کی تعلیم مکمل کی

ناگڑیاں گجرات سے قریباً پندرہ میل کشمیر سے ملحق پہاڑ کے دامن میں یہ مختصر سی تاریخی بستی
مہاراجہ اشوک کے دور میں "ناگنی" کے نام سے مشہور تھی۔ تاریخ کا دامن اس سے آگے
تہی ہے کہ یہ بستی کس نے آباد کی اور اس کا نام کیوں کر بگڑا؟ ہاں اس قدر پتہ چلتا ہے کہ مارچ
۱۸۴۴ء میں جب مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر کا سودا کیا تو کشمیر کے چند مسلمان گھرانے
یہاں آکر آباد ہو گئے۔ سیدوں کا یہ گھرانا بھی انہی میں شمار ہوتا ہے۔ جن کے ہاں آگے چل کر
سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے جنم لیا۔ یہ لوگ ہنوز اس گاؤں کی سرزمین کو اپنے نیک اور پاک
وجود سے قبروں میں آرام کرنے کے باوجود منور کیے ہوئے ہیں۔

شفقتِ پدری بیٹے کی جدائی کو زیادہ دیر گوارا نہ کر سکی اور ۱۹۱۴ء کو حافظ ضیاء الدین
اپنے بیٹے کو امرتسر سے ناگڑیاں لے گئے۔

شادی یہ سال پہلی جنگ عظیم کا ابتدائی سال ہے۔ اس سن میں یورپ کی مہذب قوموں
نے ایک دوسرے کے گریبانوں سے کھیلنے کی مشق ایجاد کی تھی اور انہی دنوں تہذیب
مغرب عریاں ہو کر ایشیا اور وسط ایشیا کے آزاد رسم و رواج کے گرد غلامی کا حصار تعمیر کرنے
کو سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد گو غلام ہندوستان کا نہ تو کوئی تمدّن رہا تھا اور نہ تہذیب کے پاس ایسا
کوئی پیرہن تھا جس کی گرہ کشائی سے گمشدہ تہذیب کی نشان دہی ہوتی۔ لیکن بجھتی ہوئی قندیلیں
ابھی ایسی روشنی دے رہی تھیں جن کے جلو میں چند حُدی خواں دکھائی دیتے تھے، جو ویران
صحراؤں میں حجازی لَے پر تہذیب کہنہ کے گیت الاپ رہے تھے۔ اسی دور میں شاہ جی کی

شادی کی رسم سید میر مرتضےٰ شاہ صاحب کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ سید میر مرتضےٰ شاہ صاحب سید ضیاالدین کے عم زاد بھائی تھے۔

لہلہاتے کھیتوں کے کنارے قدیم وضع کے دیہاتی کنوؤں نے سید زادے کی تقریب سعید پر خوشی سے دفیں بجائیں۔ گاؤں کے پیڑ باراتیوں پر اپنے دامن سے ہوا کر رہے تھے۔ بڑی بوڑھیوں نے دعاؤں کے ساتھ سہاگ کے گیت گائے۔ دیہات کی الھڑ دوشیزائیں اس آئینے میں اپنے مستقبل کی تصویریں دیکھنے لگیں۔ گاؤں کے گٹھیلے جوان جذبات کی پگڈنڈیوں پر سفر کرتے ہوئے اس شادی میں شریک ہوئے۔ ان سادہ اور اسلامی رسم ورواج کو دیہات کی سادگی نے اور جلا بخش دی، جسے دیکھ کر تہذیب مشرق دور کھڑی مسکراتی رہی۔

دوبارہ امرتسر میں

۱۹۱۵ء گزشتہ سال کی طرح یورپ کی لڑائی کا دوسرا سال تھا۔ محکوم قومیں یورپ کی ہاتھاپائی میں اپنی غلامی کی زنجیریں پختہ ہوتی دیکھ رہی تھیں۔ اسی سن میں شاہ جی شادی کی رسم سے فارغ ہوکر نصاب تعلیم مکمل کرنے پھر امرتسر آن پہنچے۔ یاد رہے اسی زمانے میں شاہ جی نے اپنی روحانی تربیت کے لیے حضرت پیر مہر علی شاہ صاحبؒ گولڑہ شریف کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔

شباب کے دن اور جوانی کی بہاریں —— آدمی کی عمر جب ان دونوں کے درمیان سے گزرتی ہے تو راستے کی ہر شئے دعوت دیتی ہے۔ نیکی اپنی طرف کھینچتی ہے تو برائی اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ اس کھینچا تانی میں کبھی برائی کا دامن تار تار ہو جاتا ہے اور کبھی نیکی اپنی کم مائیگی کا ماتم کرتی ہے، لیکن جسم میں اگر روح سعید ہو تو برائی کو شکست دینا بڑی بات نہیں ہوتی مگر نیکی کے حصول میں عمر کے اس موڑ سے گزرنا بڑا کڑوا گھونٹ ہے جسے بہت کم حلق قبول کرتے ہیں۔

یہی کشمکش کے دن تھے جب شاہ جی کو ازدواجی بندھنوں میں باندھ دیا گیا نیز حالات نے تاکید بھی کر دی کہ "دامن تر مکن ہشیار باش"۔ لہٰذا اس سال جب دوبارہ شاہ جی امرتسر آئے

تو چہرے پر سبزے کا آغاز تھا۔ جسم اگرچہ اکہرہ تھا مگر مضبوط، رنگ گندمی، کشادہ پیشانی، اٹھی بڑی چمکدار آنکھیں اور پانچ فٹ چھ انچ قد نے اس پر وہ بہار لگا رکھی تھی کہ حسن و شباب کا یہ خوبصورت گلدستہ جن راہوں سے گزرتا اپنی مہک چھوڑتا چلا جاتا شہر کے لوگ انہیں "حافظ جی" کہہ کر پکارتے۔

حضرت مولانا غلام مصطفٰے قاسمی کے درس میں دوبارہ شامل ہو کر ادھورے سبق کی تکمیل شروع کر دی گئی۔ استاد اور شاگرد کے مابین محبّت کا ایسا رشتہ قائم ہوا کہ اعتماد نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مولانا قاسمی جمعہ شاہ جی سے پڑھوایا کرتے تاکہ انہیں تقریر کے ایچ پیچ سے آگاہی ہوتی رہے۔ در حقیقت یہی وہ دن ہیں جب مستقبل کا خطیبِ اعظم فنِ خطابت کی ابتدائی منزلوں میں داخل ہوا۔

جب کلی پھول بن کر اپنی پتیاں بکھیرتی ہے تو باغ کے گل بوٹے ہی اس کی مہک سے معطر نہیں ہوتے بلکہ نسیم سحری اپنی جھولیاں بھر کر اڑوس پڑوس میں اپنا رنگ جماتی پھرتی ہے۔ شاہ جی کے قرآن کریم پڑھنے کا انداز جب عام ہوا تو شہر کے گلی محلوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ انہیں شبینوں پر بلانے لگے۔ گھروں سے نکل کر یہ آواز گلی کوچوں اور پھر بازار تک آن پہنچی۔ ع۔ دل سے نکلی در جاناں تک پہنچی۔

آخر وقت آیا کہ مسجد کے ارد گرد کے لوگوں نے مولانا غلام مصطفٰے کو مجبور کیا کہ شاہ جی کو کھلے میدان میں تقریر کرنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ پہلی تقریر اندرون گلوالی دروازہ بازار کمہاراں میں ہوئی۔ دوسری تقریر کے لیے سید گلاب شاہ نامی شخص جو مولانا غلام مصطفٰے کے معتقد تھے، شاہ جی کو امرتسر کی نواحی بستی سلطان ونڈ لے گئے۔ اس طرح یہ کلی کھلی، پھول بنا اور اس کی مہک نے ساری فضا کو معطر کر دیا۔

اِمامت

نکہتِ بادِ بہاری نے چمن بردوش ہو کر لالہ و گل سے سرگوشیاں کیں اور صحن چمن سے بوئے لالہ و گل اڑا کر لے گئی۔ شبنم کے آنسو چھنتے رہے۔ نسیم صبحگاہی سر پیٹ کر رہ گئی۔ گل بوٹوں نے لاکھ حصار کیے مگر بوئے گل اسیر نہ ہو سکی۔ کوچہ جیل خانہ کے عوام اپنی مسجد

کے لیے پیہم اصرار کے ساتھ مولانا غلام مصطفےٰ سے شاہ جی کو مانگ کر لے گئے ۔ یہ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے ۔

ہال بازار کے وسط سے شروع ہو کر کوچہ جیل خانہ رام باغ پولیس تھانہ کے سامنے ختم ہوتا تھا۔ دوسری طرف میوہ منڈی کی پشت اس کی ہمسایہ تھی ۔ اس طرف رام باغ کا بازار بھی اس کے سامنے تھا۔ اس قدر وسیع آبادی کو مسجد کی تنگ دامنی پر ہمیشہ گلہ رہا۔ لیکن شاہ جی کے خطیب منتخب ہونے پر مسجد کی وُسعتیں اور مسدُود ہو گئیں ۔ یہ زمانہ لاسلکی کا نہیں تھا اور نہ آلۂ مکبّر الصوت کا رواج تھا لیکن شاہ جی کی آواز دل اور کانوں کو مطمئن کرتی رہی ۔ نمازیوں نے مکان کی چھتوں تک کو اپنی ضرورت کے لیے اپنا لیا تھا۔

استاد کا اصرار تھا کہ سبق یہاں آکر پڑھا کریں لیکن کوچہ جیل خانہ اور بازار کمہاراں کے درمیان کا فاصلہ طے کرنے میں خاصی دقت رہتی ۔ کچھ دنوں تو یہ سلسلہ رہا۔ آخر استاد محترم کی اجازت سے شاہ جی نے ہال بازار کی مسجد خیرالدین میں مولانا نور احمد اور مفتی محمد حسن سے پڑھنا شروع کر دیا۔ مولانا نور احمد سے قرآن کی تفسیر اور مفتی محمد حسن سے مشکوٰۃ شریف کا سبق لیتے ۔

غیر اسلامی رسمیں انسانی حرکات سے انسانیت کی قدریں جس بری طرح ہلاک ہوئی ہیں زمانہ کے موجودہ چلن کے پاس اس کا کوئی مداوا نہیں ہے ۔ وقت جیسے جیسے اپنا سفر طے کر رہا ہے ان پگڈنڈیوں پر کانٹے ہی کانٹے بکھرتے چلے جا رہے ہیں ۔ اس میں زیادہ مجرم وہ ہیں جن پر اسلام کا لیبل چسپاں ہے ۔ مذہب جس قدر شفاف ہے مسلمان کا کردار اتنا ہی گدلا اور داغدار ہے ۔ تاریخ کا سینہ ان زخموں سے اٹا پڑا ہے ۔

صراطِ مستقیم سے ٹھوکر کھانے کے بعد مسلمان جن غلط راستوں پر گامزن ہوا ان میں اسلام سے انحراف کی راہ اسے زیادہ پسند آئی ۔ سماج کے غلط رسم و رواج اس راستے کے خوبصورت پھول تھے جن سے مسلمان نے اپنی جھولیاں بھریں لیکن بعد میں انہی پھولوں نے کانٹے بن کر اس کے کردار کو زخمی کر دیا ۔ ۱۹۱۹ء سے پیشتر کا امرتسر خلافِ اسلام رسوم کی آماجگاہ تھا ۔ گھر کے

ہر طانچے میں رسم و رواج کے بُت نصب تھے۔ برادری میں برتری حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ میں مصروف مسلمان نے اپنا اثاثہ حیات داؤ پر لگا دیا تھا۔

کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اس کے ختنوں پر گھوڑی اور باجا لازمی تھا کیونکہ برادری میں "فلاں" نے ایسا کیا تھا۔ گرہ اس کی متحمل ہے یا نہیں لیکن "سنت" کے اس موقع پر خلافِ سنّت حرکات لازمی تھیں۔

اگر کسی کے ہاں موت واقع ہو جائے تو میّت کے آخری مقام پر پہنچنے سے پہلے ماتم پرسی کرنے والے عزیزوں کی خاطر داری، برادری کا ضروری قانون تھا اور یہ سلسلہ چار دن تک جاری رہتا۔ جہلا کی ان حماقتوں کے باعث ملاؤں کے ہاں چالیس روز تک گھی کے چراغ جلتے۔

عورت بیوہ ہو جائے، بچے یتیم رہ جائیں لیکن رسومات کے آئین میں سُقم نہیں آنا چاہیے۔ مرنے والے کے کفن دفن پر خرچ ہو اور رہا سہا برادری چٹ کر جائے۔ گویا گھر کا ایک فرد کیا مرا سارا گھر مر گیا۔

لحد سے مہد تک کے درمیان ایک اور حادثہ گزرتا ہے جسے بیاہ شادی کا نام دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ ابنِ آدم کے لیے یہ منزل ضروری ہے لیکن یہ کہاں ضروری ہے کہ ایسے موقع پر برادری میں ناک رکھنے کے لیے آدمی خاک ہو جائے۔ اگر امرتسر کے مسلمان نے زمانہ سازی کے لیے اس تقریب پر اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلائے۔ چند سالوں کے بعد قرض لی ہوئی رقم سود در سود میں مسلمانانِ امرتسر کی بیشتر جائداد غیر مسلموں کے قبضے میں چلی جاتی۔ ان حالات نے مسلمانوں کو ملکیت سے محروم کر کے یا تو ہندو کا کرایہ دار بنا دیا یا پھر انہیں شہر سے باہر کی طرف رُخ کرنا پڑتا۔ اس طرح امرتسر پر ہندو کا قبضہ ہوتا چلا گیا۔ پہلو میں دلِ آگاہ رکھنے والے مسلمان کے لیے خون کے آنسو رونے کے سوا اور تھا ہی کیا۔ انہی دنوں شاہ جی نے کوچہ جیل خانہ کی مسجد سے نکل کر محلہ وار تقریروں کا آغاز کیا۔ قلیع رسوم پر یہ پہلی یلغار تھی جو مسجد کے ایک درویش نے کی جس کے پاس زبان اور قرآن کی قوت کے سوا تیسری طاقت نہیں

تھی کردہ مسلمان کو غارت گری کے راستوں پر چلنے سے منع کرتا۔

وہ دن بھر اساتذہ سے جو پڑھتے شام ہوتے ہی کسی نہ کسی محلہ میں وعظ کی صورت میں سنا آتے۔ ان دنوں مولانا ثناء اللہ کا امرتسر میں خاصا اثر تھا لیکن مخصوص عقیدت کی بنا پر وہ بات پیدا نہ ہوسکی جو شاہ جی کے طرز تکلّم نے پیدا کر دی۔

علم محض پڑھائی سے نہیں طلب اور خدمت سے ملتا ہے۔ شاہ جی کا علم اگرچہ ہنوز خام تھا لیکن اساتذہ کی محبّت اور کتاب اللہ کی برکت سے وہ جاہلوں میں عالم اور عالموں میں عزّت کی نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ امرتسر کے در و دیوار انہیں سننے اور دیکھنے کو چشم براہ رہتے۔ قبیح رسموں کے خلاف جہاد نے شاہ جی کو وہ احترام دیا کہ جس محلے میں وہ وعظ فرماتے انسانوں کے سمندر اُمڈ آتے۔

اس طرح شہر کے اندر ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔ رسم و رواج اور عُلماءِ سوء کے درمیان راہ و رسم بڑھنے لگے۔ مذہب کے گرد حصار کی نئی استوار ہونے والی دیوار کو گرانے پر شب و روز مشورے ہونے لگے اور شاہ جی کے خلاف ایک ایسے گروہ کی تنظیم ہوئی، جس کے رزق کا انحصار جھُوٹ کے چراغ روشن کرنا اور کذب کو حقیقت ظاہر کرنا تھا۔

یہ تحریک ابھی اپنے پر پرزے نکال رہی تھی کہ یورپ کے سیاسی اُفق پر پہلی جنگ عظیم میں محوریوں کے ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخیاں دکھائی دیں۔

جلیانوالہ باغ کا حادثہ

۱۹۱۴ء کی لڑائی ختم ہوتے ہی اتحادی طاقتیں فتح و نصرت کے علم لیے سمندر کی چھاتی پر رقص و سرود میں کھو گئیں۔ اس محویّت میں وہ یہ بھول گئیں کہ انہوں نے غلام ہندوستان کے ساتھ کسی رشتۂ اتحاد کو گرہ دی تھی، کسی وعدہ کی وفا ان کے ذمّے ہے۔

۱۶۔ اگست ۱۹۱۸ء کو برطانوی حکمرانوں نے ایک اعلان کیا کہ ہندوستانیوں کو آئندہ فوجی کمیشن میں اعلیٰ عہدے دیے جائیں گے حالانکہ جنگ کے اختتام پر ہندوستان کو

ذمے دار گورنمنٹ دیے جانے کا وعدہ تھا۔ اس آئینہ میں ہندوستان کو اپنے حکمرانوں کی نیت صاف دکھائی دی اور ان کا شبہ نکھر کر سامنے آگیا۔ چنانچہ وہ زنجیر ٹوٹ گئی جس سے برطانوی سامراج نے اپنے غلاموں کو باندھ رکھا تھا۔

ہندوستان کی پریشان قومیں پھر سے متحد ہوئیں اور انہیں اپنے مقدر کا از سر نو جائزہ لینا پڑا۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کو مولوی اے۔ کے۔ فضل حق کی صدارت میں دہلی مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، جس میں استقبالیہ کی صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے کی۔ گو ڈاکٹر صاحب کا خطبہ استقبالیہ حکومت نے ضبط کرلیا لیکن اس اجلاس میں مطالبہ کیا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان نے انگریزوں سے وفاداری کا عہد پوری ذمہ داری سے نبھایا ہے، لہٰذا برطانوی حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے وعدوں کی روشنی میں ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دیں۔ اس قرارداد کی تائید میں مفتی کفایت اللہ مولانا احمد سعید، مولانا عبدالباریؒ فرنگی محل (لکھنؤ) مولانا آزاد سبحانی (لکھنؤ) مولانا ثناء اللہ امرتسری نے تقریریں کیں۔ اس طرح پورے ملک میں انگریز حکمرانوں کے خلاف وعدہ شکنی کی آگ بھڑک اٹھی۔ اندرونِ یورپ ترکوں سے صلح کے بعد بھی برطانوی دانشوروں نے ایسا ہی سلوک کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محکوم و حاکم کے درمیان دلوں کی بھٹیاں اس قدر شعلہ فشاں ہوئیں کہ ہندوستان کا امن، دُودِ چراغِ محفل بن کر رہ گیا۔

حادثات و واقعات کی مسلسل کڑیاں کچھ اس ترتیب سے پیہم ہوئیں کہ ایوانِ افرنگ کی دیواریں اسی سلاسل میں جکڑی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

آخر انگلینڈ کی سپریم کورٹ کے جج مسٹر ایس، اے، ٹی رولٹ کی زیر کمان ایک کمیٹی نے (جو برطانیہ کے یہودی وزیر اعظم مسٹر لارڈ جارج نے مقرر کی تھی) اپنی دانست میں بغیر تحقیق کے ہندوستان پر تشدد اور دہشت انگیزی کے ایسے الزامات تراشے، جنہوں نے جلتی پر تیل چھڑکا (مسٹر رولٹ کی یہی رپورٹ ماضی کی سیاسی تاریخ میں رولٹ ایکٹ کے نام سے مشہور ہے) اس رپورٹ کے نتیجے میں ہندوستان نے ایک نئی سیاسی کروٹ لی اور کانگریس

کی باگ ڈور جو پہلے مسٹر تلک راج گوکھلے کے ہاتھوں میں تھی مہاتما گاندھی کے سپرد کر دی گئی۔
یہ پہلا موقع تھا کہ مہاتما گاندھی ہندوستانی سیاست میں براہِ راست دخیل ہوئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاجاً ۶-اپریل ۱۹۱۹ء کو ہندوستان بھر میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر آریہ سماجی رہنما مسٹر شردھانند جیسے کٹڑ ہندو نے دہلی کی جامع مسجد میں ہندو مسلم اتحاد پر تقریر کی اور امرتسر میں ہندو مسلمانوں نے ایک ہی برتن میں پانی پیا۔ یہ رام نومی کے تہوار کا دن تھا۔

دو مختلف قوموں کے درمیان انگریز کی نفرت نے ایسا میل لگایا کہ فرنگی سامراج کا وقار کھلونے کی طرح ٹوٹ کر رہ گیا۔ ہڑتال جاری تھی مگر انگریز کا تشدد شہر میں اپنا کام کرتا رہا۔ اس ظلم و جور کے خلاف شہریوں کا ایک جلوس ڈپٹی کمشنر امرتسر کی کوٹھی پر جاتے ہوئے جب ریلوے کے بڑے پل پر سے گزرا تو انگریز سپاہیوں نے بغیر وارننگ دیئے اس ہجوم پر گولی چلا دی جس کے نتیجے میں چھ ہندوستانی شہید ہوئے۔

خدمتِ خلق

شاہ جی ان دنوں حصولِ تعلیم، مسجد کی امامت اور خلافِ شرع رسوم کے خلاف جہاد میں مصروف تھے۔ فرنگی تشدد کے شہدا کی لاشیں موقع واردات سے اٹھا کر ہال بازار خیرالدین کی مسجد میں لائی گئیں تو شاہ جی نے ان سب کو غسل دیا، کفن پہنائے، مسلمانوں کا جنازہ پڑھایا اور تمام لاشوں کو خود مسجد سے رخصت کیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ شاہ جی نے غیرارادی طور پر خدمت خلق سے مرنے والوں کی تجہیز و تکفین کی۔ اتنے سے کام نے شاہ جی کا نام غیر مسلموں کے دلوں میں نقش کر دیا۔ حالانکہ وہ سیاسیات سے قطعاً نا آشنا تھے۔ انہیں صرف یہی دھن تھی کہ امرتسر کا مسلمان فضول رسم و رواج سے باز رہے لیکن ان کی ہمدردی نے انہیں کافی شہرت دی۔ اپنے اور پرائے انہیں احترام کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

مارشل لاء

امرتسر کے عوام انگریز سامراج کے خلاف اپنا امن کھو چکے تھے۔ دلوں کی سلگتی ہوئی بھٹیوں کے الاؤ اس قدر روشن ہو چکے تھے کہ غلامی کی زنجیریں صاف پگھلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ بنکوں اور دوسری سرکاری عمارات کی جلی ہوئی راکھ سے بغاوت کی بُو پھیل رہی تھی۔

۱۰۔ اپریل کو طلوع ہونے والے آفتاب نے امرتسر کو ماتمی لباس میں دیکھا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد غلاموں پر آقاؤں کا تشدد اور نکھرا۔ شہر پر فوج نے قبضہ کر لیا اور مارشل لاء کا اعلان کر دیا گیا۔ امرتسر کے شب و روز فوجی آئین کے تحت بسر ہونے لگے۔ شہر میں گورکھا سپاہیوں کا راج تھا۔ ہر موڑ پر ٹکٹکی باندھ دی گئی۔ صرف ہندوستانی ہونے کے جرم میں بید زنی کی سزائیں عام دی جانے لگیں۔ ہر راہگیر کو پیٹ کے بل چلنے پر مجبور کیا جانے لگا۔ ان واقعات نے خوف و ہراس کو جنم دیا۔ بازار اور گلیاں ویران صحرا کی طرح نظر آنے لگیں۔ گھروں کے دروازوں اور کھڑکیوں پر جانوروں نے رین بسیرے بنا لیے۔ اس جمود کو کبھی کبھار فوجی سپاہیوں کے بوٹوں کی چاپ توڑ دیتی تھی لیکن دلوں پر جمود بدستور رہا۔

جلیانوالہ باغ

۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کا دن تاریخ کے دامن پر ایسی گرہ دے چکا ہے کہ یہ گرہ جب بھی کھولی جائے گی، ناکردہ گناہ انسانوں کا خون اپنے قاتل پر مسکراتا نظر آئے گا۔

مرحوم پنجاب میں یکم بیساکھ دیہاتی عوام کی خوشیوں کا دن ہوتا تھا۔ اس تہوار پر گاؤں کے جیالے جوان کندھوں پر لاٹھیاں لیے رنگا رنگ لباس پہنے، دیہاتی گیت گاتے امرتسر کی سڑکوں پر سے گزرتے تو شہری عوام کو بھی اپنی بولیوں میں شامل کر لیتے۔ "ماجھے دا جٹ" پنجاب کے صحت مند حسن کا ہراول دستہ تھا۔ بیاس اور دریائے ستلج کے پانی نے مل کر اس کی پرورش میں رنگ بھر دیا تھا۔ ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کا یہی دن تھا جب دیہاتی عوام اور شہری لوگ اپنے رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف احتجاجاً جلیانوالہ باغ میں جمع ہوئے تو جنرل ڈائر نے اچانک ان پر گولی چلا دی۔ اس کے نتیجے میں پانسو سے زائد بے گناہ ہندوستانی شہید ہوئے اور زخمیوں کی تعداد

کہیں زیادہ تھی۔

۶-اپریل کو جس کہانی کا آغاز ہوا تھا۔ ۱۳-اپریل کو جب مکمل ہوئی تو تاریخ اور انسانیت کے سینے پر گہرا گھاؤ چھوڑ گئی۔ اب جب کبھی یہ زخم رستے ہیں، تو انسانوں کے دل اور تاریخ کے اوراق فرنگی حکمرانوں کے لیے نفرین کیے بغیر نہیں رہتے۔

احساس اُبھر آیا

چوٹ کھایا ہوا دل جب سنبھالا لیتا ہے تو وارفتہ انتقام کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ خرد لاکھ آڑے آئے مگر جنون اپنا کام کر جاتا ہے۔ جلیانوالہ باغ کا حادثہ اہلِ دل پر بادِ سموم کی طرح گزر گیا جس سے وہ سانپ کی طرح بل کھا کر رہ گئے مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ درد گھاؤ بنیا چلا گیا۔

شاہ جی انہی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۶-اپریل کو جن ہاتھوں نے شہدائے وطن کو کفن پہنائے تھے وہی ہاتھ حکمرانوں کے لیے کفن سینے کی تیاری میں لگ گئے۔ شاہ جی ان واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ چنگاری ہوا کی منتظر تھی۔ ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

آغازِ سفر

پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستان سے کیے گئے وعدوں سے انحراف کے بعد انگریز حکمرانوں نے ترکوں سے بھی عہد وفا توڑ دیا۔ اس کی صدائے بازگشت جب ہندوستان پہنچی تو مسلمان خلافت کے مسئلہ کو مذہب کی بنیاد پر سوچنے لگے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء کو دہلی میں مؤتمر اسلامی کے عنوان سے مسلمان رہنما جمع ہوئے۔ ان کے علاوہ مہاتما گاندھی اور سوامی شردھانند کو بھی دعوت دی گئی۔ اس اجلاس میں "ترک موالات" اور سودیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی (رحمۃ اللہ علیہ) پنجاب میں پہلے عالمِ دین تھے، جنہوں نے تحریک خلافت کو ہوا دی اور محلہ وار تقریروں سے عوام پر یہ مسئلہ روشن کیا۔

شاہ جی ان دنوں صرف مذہبی واعظ تھے لیکن کبھی کبھار ان کی مڈبھیڑ سربراہ مولانا داؤد غزنوی سے ہو جاتی۔ یہاں تک کہ مولانا داؤد غزنوی اگر [illegible]

کر کے ان کی تردید کر دیتے ۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ مولانا داؤد غزنوی نے شاہ جی کو دعوت دی کر یا تو مجھے اپنے مکان پر بلائیں یا میرے مکان پر تشریف لائیں ۔ میں آپ سے مسئلہ خلافت پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں ۔ آخر مولانا داؤد غزنوی خود شاہ جی کے دولت کدہ پر چل کر گئے اور خلافت عثمانیہ کا خاتمہ، ترکوں سے انگریزوں کی عہد شکنی اور عالم اسلام پر فرنگی حکمرانوں کی چیرہ دستیاں کچھ اس انداز سے بیان کیں کہ آخر شاہ جی مولانا داؤد غزنوی کے ہم آہنگ ہو گئے ۔ اس گفتگو کے بعد شاہ جی نے روزانہ اخباروں کا مطالعہ شروع کر دیا ۔ جس سے حالات اور واضح ہو کر سامنے آ گئے ۔

پھر کیا تھا، آبگینے کو ٹھیس لگنے کی دیر تھی، وہ ساری مستی بہہ نکلی بزم عشاق جس کی منتظر تھی ۔ وہ آتش فشاں پھٹ گیا جس کی راکھ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی ۔ وہ لاوا بہہ نکلا جو فرنگی سامراج کو تنکے کی طرح بہا کر لے گیا ۔

پہلی سیاسی تقریر

بعض دفعہ فرد، برائی پوری قوم کو لے ڈوبتی ہے ۔ جنرل ڈائر کی حرکت نے نہ صرف جلیانوالہ باغ کو ہی بے گناہوں کے خون سے رنگین کیا بلکہ یہ چھینٹے اقوام یورپ کے دلوں تک بھی پہنچے جس سے ان کی نگاہیں انسانیت کے سامنے شرمندہ رہیں گی ۔ اس زخم پر مرہم کے لیے یورپین جراحوں نے نسخہ تجویز کیا کہ تمام ہندوستانی راہنماؤں کو جیلوں سے رہا کر دیا اور ساتھ ہی ہندوستان کو آزادی کی چوتھی قسط دینے کا اعلان کیا ۔ ان اصطلاحات کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ صوبوں کی عنانِ حکومت ہندوستانی وزیروں کو سونپ دی جائے گی مگر مالیات کا محکمہ انگریز گورنروں کے پاس رہے گا ۔

اس برطانوی تجویز پر غور کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ علی برادران بھی رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے ۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی اسی موقع پر حکیم محمد اجمل خاں (رحمۃ اللہ علیہ) کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ خلافت کانفرنس بھی انہی تاریخوں میں امرتسر (گول باغ) میں مولانا شوکت علی کی صدارت

میں منعقد ہوئی جس میں پہلی دفعہ شاہ جی نے سیاسی تقریر کی اور حاضرین کو اس قدر متاثر کیا کہ خلافت کمیٹی کے لیے دس لاکھ روپے کے چندے کی اپیل کی۔ مولانا محمد علی جوہر نے پہلی مرتبہ اس اجتماع میں شاہ جی کو سنا اور دیکھا تو قافلے میں نئے ساتھی کی شرکت پر خوش ہوئے اور ساتھی بھی ایسا کہ نہ صرف سالارِ کارواں رشک کرنے لگے بلکہ غبارِ کارواں نے بھی قدم لیے اور خوش آمدید کہی۔

ترکِ موالات

۱۹۲۰ء کا سال حریت پسند عوام کے لیے جدوجہد کا اہم سال تھا اس سال مئی میں کانگریس نے اپنے بنارس سیشن میں برطانوی سامراج سے ترکِ موالات کا فیصلہ کیا۔ اسی ہفتے ناگپور میں مسلم لیگ نے بھی ترکِ موالات کی قرارداد منظور کر کے کانگریس اور خلافت کمیٹی کی تائید کی۔ اس قرارداد کی مزید تشریح جب کلکتہ کانگریس کے سیشن فروری ۱۹۲۱ء کو مہاتما گاندھی نے کی تو مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی کے سوا ساری ورکنگ کمیٹی گاندھی جی کے خلاف ہو گئی۔

کانگریس کے کھلے اجلاس میں مولانا آزاد نے قرارداد کے حق میں تقریر کی تو شاہ جی اس اجلاس میں موجود تھے۔ وہ تقریر سے بے حد متاثر ہوئے اور آخر میں جب انہوں نے قرارداد کے مؤید کے طور پر تقریر کی تو سارا ہال ترکِ موالات کے حق میں ہو گیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ شاہ جی اور گاندھی جی ایک دوسرے سے متعارف ہوئے اس تحریک کے نتیجے میں بچوں نے سکول، نوجوانوں نے کالج اور وکلاء نے عدالتوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ ولائتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک زور پکڑ گئی۔

لاہور خلافت کمیٹی

سارے ملک میں ان دنوں خلافت کمیٹیاں قائم کی جا رہی تھیں لاہور کے اعتدال پسندوں نے بھی خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد اقبال جو ان دنوں "سر" نہیں تھے) اور میاں محمد شفیع (جو بعد میں سر شفیع کے نام سے مشہور ہوئے) دونوں بالترتیب صدر اور سیکرٹری منتخب ہوئے۔

اس زمانہ میں جنرل سر ائیکل ایڈوائر پنجاب کے گورنر تھے۔ ان کے اشارے پر لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے دونوں کو کچھ کہا سنا تو دوسرے دن یہ خلافت کمیٹی توڑ دی گئی۔

ان دنوں شاہ جی کے جذبات اور انگریز کا تشدد دونوں شباب پر تھے۔ دونوں کے ٹکراؤ نے نوجوانوں کے ہاتھ فرنگی سامراج کے گریبان تک پہنچا دیئے۔ حکیم عبدالمجید عتیقی (مرحوم) اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جب پہلی خلافت کمیٹی انگریز حاکموں کے خوف سے دم توڑ چکی تو میں امرتسر میں مولانا ثناءاللہ کے ہاں پہنچا۔ عرض حال کیا تو انہوں نے شاہ جی کو میرے ساتھ لاہور جانے کا حکم دیا۔"

لاہور ان سے ناآشنا تھا۔ موچی دروازہ کے شمال کی جانب باغ میں دن کے گیارہ بجے جلسے کا اعلان کیا گیا۔ باغ میں موسم سرما کے باعث اوباش قسم کے لوگ دھوپ تاپ رہے تھے لیکن جلسہ کے شائق بہت کم تھے۔ کوئی اسٹیج کا انتظام نہیں تھا۔ تین چار سو کے قریب حاضری تھی۔ شاہ جی نے ایک گھنٹہ تک صرف قرآن کریم پڑھا اور ظہر تک تقریر کی۔ نماز کے بعد دوبارہ جلسہ کا اعلان کیا گیا۔ اب کے حاضری پہلے سے زائد تھی۔ اس جلسے میں فیروز کاڑے والا دیہی شخص بعد میں میاں فیروزدین احمد کے نام سے مشہور ہوا) کہیں سے ایک کرسی اور میز اٹھا لایا۔ یہ اجلاس عصر کی نماز کے لیے ملتوی کیا گیا اور جب دوبارہ جلسہ شروع ہوا تو حاضری پانچ ہزار کے قریب تھی۔ شاہ جی قرآن حکیم کی آیات پڑھتے اور ساتھ ساتھ اس کی تفسیر بیان کرتے جاتے اور لوگ تھے کہ اس طرح بیٹھے تھے جیسے کسی نے سحر پھونک دیا ہو۔ مولانا سید حبیب (روزنامہ سیاست کے مالک و مدیر) اس اجلاس میں شریک تھے۔ یہ اجلاس مغرب اور عشا کی نماز کے لیے ملتوی ہوا۔

اب نافہ کی خوشبو لاہور کی گلیوں اور بازاروں میں پھیل چکی تھی۔ ایک نے سنا دوسرے کو سنایا۔ "کوئی ڈنڈے والا پیر آیا ہوا ہے"۔ (شاہ جی اس زمانہ میں اپنے ہاتھ میں ایک موٹا

ساڈنڈار کھتے تھے اور ایک مدت تک اسی نام سے مشہور رہے)

"وہ قرآن پڑھتا ہے تو ایسا معلوم دیتا ہے جیسے ابھی آسمان سے نازل ہو رہا ہے۔ اس کی آواز میں جادو ہے۔ آج اس لے سارے لاہور کو مسحور کر دیا ہے"

پھر کیا تھا۔ عشا کی نماز کے بعد جو اجلاس ہوا۔ اس میں بیس ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی۔ شاہ جی نے صبح تین بجے تک عوام سے خطاب کیا اور آخر میں کہا

"کون ہے جو کہتا ہے لاہور میں خلافت کمیٹی نہیں بن سکتی۔ میں کہتا ہوں کس مائی کے لال میں ہمت ہے کہ اس کو توڑ کر دکھائے"

اسی اجلاس میں سید حبیب کو خلافت کمیٹی لاہور کا صدر اور میاں فیروز دین احمد کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ نیز چندے کی اپیل کی تو لوگوں نے دل کھول کر روپیہ دیا۔ عورتوں نے اپنا زیور تک اتار کر بھیج دیا۔ آخر شاہ جی کو اعلان کرنا پڑا کہ آپ اور روپیہ نہ دیں۔ کل صبح جب خلافت کمیٹی کا دفتر قائم ہو جائے گا تو آپ اس روپیہ کی رسید بھی لے لیں اور دوسرا روپیہ جو دیں اس کی بھی رسید لیں۔

چنانچہ دہلی دروازہ کے باہر میاں سراج دین پراچہ کے مکان میں خلافت کمیٹی کا دفتر قائم ہوا اور مدت تک یہی دفتر رہا۔

مرزا بشیر الدین محمود سے پہلی ٹکر

ترکِ موالات کی تحریک نے سارے ہندوستان کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا بچے، جوان، بوڑھے اور مستورات غیر ملکی غلامی سے نجات کے لیے ایثار و قربانی کے تمام ارادوں سے مسلح ہو کر حالات سے مقابلے کے لیے تیار تھے۔ گرفتار ہونے والے رہنماؤں سے جیل خانوں کی وسعتیں تنگ ہو چکی تھیں۔ فرنگی سامراج اپنے اقتدار کے ڈھلتے ہوئے سورج کا تماشا کر رہا تھا کہ قادیانی مذہب کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود انگریزوں سے اپنی جنسِ وفاداری کا بھاؤ بڑھانے اور انگلستان

کی منڈیوں میں اس سودے کو مزید جلا دینے کے لیے ہندوستان کے اتحاد میں زہر گھولنے کو آموجود ہوا۔

آریہ سماجی لیڈروں کے خلاف اسلام کی آڑ میں جھگڑا مول لیا اور ساتھ ہی مسلمانوں سے اعتقادی لڑائی بھی چھیڑ دی۔ قادیانیوں نے یہ حرکت ایسے موڑ پر کی جب حکمرانوں کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ قریب تھا کہ یہ آگ پھیل کر اتحاد آزادیٔ وطن کو راکھ کر ڈالے کہ شاہ جی نے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو اس آگ میں جھونک دیا۔

۱۹۲۵ء کے وسط کی بات ہے کہ بندے ماترم ہال امرتسر میں دن کے گیارہ بجے مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے جلسے کا اعلان کیا اور شہر کے مسلمانوں کو شمولیت کی دعوت دی۔ عوام کے ساتھ شاہ جی بھی اس اجتماع میں شامل ہوئے۔ جلسے کے گرد مرزائیوں نے انتظام کا پورا جال پھیلا رکھا تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی انتظامی امور سے لیس تھی۔

مرزا بشیر الدین محمود نے تقریر کے دوران کسی حدیث کے الفاظ غلط پڑھ دیئے۔ اس پر شاہ جی نے مجمع سے اٹھ کر بشیر الدین محمود کو حدیث کے غلط الفاظ پڑھنے پر ٹوکا لیکن مرزائی لیڈر اپنی ضد پر اڑا رہا اور شاہ جی اپنے مؤقف پر قائم رہے۔ یہ ہنگامہ آرائی تقریباً بیس منٹ تک جاری رہی تو مرزائیوں نے پولیس کو طلب کر لیا۔ اس پر شاہ جی نے عوام سے کہا کہ جس قدر مسلمان جلسہ میں ہیں وہ ہال سے باہر آجائیں۔ چنانچہ مرزائیوں کے سوا مسلمان شاہ جی کے حکم کی تعمیل میں ہال سے باہر نکل آئے۔ باہر شاہ جی نے مرزائیوں کے خلاف تقریر شروع کر دی۔ اس پر بشیر الدین محمود کو اپنی پارٹی سمیت ہال کے عقبی دروازہ سے پولیس کی حفاظت میں نکلنا پڑا لیکن شاہ جی بدستور تقریر کرتے رہے۔

اس ایک ہلکی سی چپقلش کا اثر یہ ہوا کہ مرزائیوں کے منصوبے ختم ہو گئے اور ان کے

خلافت اور ترک موالات کی مشترک ایجی ٹیشن نے سارے ہندوستان کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایک کر دیا تھا۔ غیر ملکی قانون اپنی ساری قوت کے باوجود کمزور اور بے کار سمجھا جانے لگا۔ اسی زمانہ میں ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیز گلؒ مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان پہنچ گئے۔ ان کی رہائی سے تحریک آزادئ وطن کو مزید تقویت ملی۔ خلافت کمیٹی کی شاخیں ہر شہر اور قصبہ میں قائم ہونے لگیں۔

آزاد ہائی سکول گجرات

اسیرانِ مالٹا وطن واپس پہنچ کر اپنے مقاصد میں مصروف ہو گئے۔ حضرت مدنیؒ تحریک خلافت میں شامل ہو گئے اور حضرت شیخ الہندؒ کو جمعیۃ العلمائے ہند نے اپنا صدر منتخب کر لیا۔ انہی دنوں مولانا محمد علی جوہرؒ نے دہلی میں جامعہ ملیّہ کی بنیاد رکھی جس کے تحت ملک کے اکثر شہروں میں تعلیمی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ جس میں وہ بچے داخل ہوئے جنہوں نے تحریک ترک موالات کے سلسلے میں سرکاری سکول چھوڑے تھے۔

شاہ جی نے گجرات میں آزاد ہائی سکول کی بنیاد رکھی، جس کا افتتاح مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ چوہدری فیض محمد ایم۔ اے ہیڈ ماسٹر اور ملک نصر اللہ خاں عزیز سیکنڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔

آزاد ہائی سکول کی تمام تر ذمہ داری شاہ جی پر تھی۔ وہ ضلع گجرات میں خلافت کمیٹیاں قائم کرتے اور آزاد ہائی سکول کے لیے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ شاہ جی کو ضلع بھر میں اس قدر مقبولیت ہوئی کہ ۱۳۰۰ خلافت کمیٹیاں اسی ایک ضلع میں قائم ہوئیں۔ عورتوں نے اپنے زیور اور مردوں نے اثاثہ حیات تک ان کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔

شب و روز کی محنت اور شاہ جی کی تقریروں نے ضلع بھر کے مرد و زن کو ستاروں کی طرح ان کے گرد جمع کر دیا۔ ضلع گجرات کا ڈپٹی کمشنر کنور دلیپ سنگھ جس نے عیسائیت چھوڑ کر سکھ مذہب اختیار کر لیا تھا، لباس تبدیل کر کے شاہ جی کی ہر تقریر میں شامل ہوتا۔ آخر اسے حکومت نے مجبور کیا کہ وہ شاہ جی کو گرفتار کر لے لیکن اس نے ہمیشہ

پہلو تہی کی۔ اس کی رائے تھی کہ عطا اللہ شاہ بخاری نے ضلع گجرات کے عوام پر جادو کر رکھا ہے۔ وہ ان کے دل و دماغ پر قابض ہے۔ اگر اسے ان دنوں گرفتار کیا گیا تو ضلع بھر میں حکومت کے خلاف بغاوت پھیل جانے کا ڈر ہے۔

ضلع گجرات باقی ہندوستان کی طرح بغاوت کی سلگتی ہوئی آگ کو ہوا دے رہا تھا۔ آزاد ہائی سکول کے طلباء کے دلوں میں انگریز حکمرانوں کے خلاف نفرت کی تخم ریزی اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی تھی۔ اس دوران میں شاہ جی کبھی کبھار پنجاب کے دوسرے اضلاع میں جاتے رہے لیکن گجرات ان کی سرگرمیوں کا محور تھا جس کے باعث ہزاروں طلباء نے تعلیم حاصل کی اور گجرات کے عوام آزادی وطن کے لیے کفن بردوش ہو کر میدان کارزار میں نکل کھڑے ہوئے۔

تحریکِ ہجرت دن گزرتے گئے۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کے منہ زور گھوڑے برطانوی سامراج کا نظم و نسق روندتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ لیکن انگریزی راج کے تشدد نے وقت اور حالات میں ایسا زہر گھولا کہ ۱۷۶۵ء میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ کہ

> "انگریزی حکام اگر ان (مسلمانوں) کے کسی معاہدے کو توڑ ڈالیں یعنی نماز باجماعت یا جائز شرعی رسومات یا مسجد کی تعمیر یا ادائے حج یا اسلامی قانون میں دخل انداز ہوں تو پھر ان سے جہاد فرض ہو جائے گا لیکن اگر جہاد ناقابل عمل ہو تو پھر ہر دین دار مسلمان پر ہجرت لازم آتی ہے۔"

علمائے ہند کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔ چنانچہ مولانا عبدالباری (فرنگی محل لکھنؤ) نے اپریل ۱۹۲۰ء کو فتویٰ دیا کہ

> "فرنگی حکومت نے اپنی مسلمان رعایا سے جو وعدے کیے تھے وہ ان سے منحرف ہو چکی ہے۔ نیز ہندوستان کی غیر مسلم رعایا پر ان کا تشدد بڑھ کر مذہب میں بے جا مداخلت کرنے لگا ہے۔ بدیں حالات ہندوستان دارالحرب ہو چکا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے کسی ایسے ملک چلے جائیں جہاں کی

قلدین اسلام سے ملحق ہوں"

اس فتویٰ کا شائع ہونا تھا کہ والئے افغانستان غازی امان اللہ خاں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ افغانستان ہندوستانی مہاجروں کو اپنے ہاں پناہ دینے کے لیے تیار ہے۔

خلافت اور ترک موالات ایسی تحریکات کی موجودگی میں ہجرت کی تحریک نے علماء اور دوسرے رہنماؤں کو پریشان کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری ان دنوں لندن میں ہندوستانی وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور خود مہاتما گاندھی تحریک ہجرت کو آزادی وطن کے لیے مضر خیال کر رہے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ آزادی کی لڑائی ملک کے اندر بیٹھ کر لڑی جانی چاہیے، وطن کو چھوڑ کر چلے جانا مفید نہیں۔ دوسری طرف علمائے فرنگی محل اور شاہ جی تحریک ہجرت کو کامیاب بنانے میں سرگرم عمل تھے۔ پنجاب میں مولانا محمد بخش خطیب جامع مسجد راولپنڈی، مولانا احمد علی لاہوری، عزیز ہندی، خاں عبدالغفار خاں، علامہ حسین میر کاشمیری، اقبال شیدائی اور دوسرے رہنما عوام کو ہجرت کی دعوت دے رہے تھے۔

انہی دنوں ترک، جرمنی اور روس کے فوجی جرنیل، غازی امان اللہ سے افغانستان میں گفتگو کر رہے تھے کہ اگر ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف وہاں کے عوام بغاوت کر دیں تو ان کی فوجی امداد کی جائے تاکہ ہندوستان انگریزی تسلط سے آزاد ہو جائے۔

اس مشورے کے پس منظر میں مولانا عبیداللہ سندھی کا ہاتھ تھا جو پہلی جنگِ عظیم کے شروع میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے حکم پر افغانستان چلے گئے تھے۔

اس تحریک کی موجودگی میں برطانوی حکومت نے ہجرت کی تحریک کو خلافت اور ترک موالات سے زیادہ خطرناک سمجھا اور اس کی روک تھام میں حیلے بہانے تراشے۔ چنانچہ کئی قسم کے لوگ اس تحریک کے راستے کے روڑے بنے۔ ان میں لاہور کے مولوی عبدالحق اور عبدالرحمٰن نامی شامل تھے۔ جنہوں نے غیر ملکی حکومت کی جاسوسی کی اور ہجرت کے رہنماؤں پر بداعتمادی کا اظہار کیا۔

بعد میں یہ دونوں خود فرنگی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔

تحریک ہجرت خوفناک قسم کے دو گروہوں کے درمیان چلنے لگی۔ اول وہ جو دیانت داری سے اس تحریک کو آزادیٔ وطن کے لیے غیر مفید سمجھتا تھا۔ دوسرا وہ جنہیں حکومتِ وقت کی خریدکردہ جنس کہا جا سکتا ہے۔ اس گروہ کے پاس دلائل اوّل الذکر گروہ سے مستعار لیے ہوئے تھے یا پھر جن کی پشت پر رائج الوقت سکے کی جھنکار تھی۔

ایسے میں علمائے فرنگی محل کا فتویٰ اور شاہ جی کی آواز کو اپنوں اور پرایوں کے درمیان سے گزر کر عوام تک پہنچنا مشکل ہو رہا تھا۔ تاہم مئی جون کے مہینوں میں ہجرت کی تحریک اپنے جوبن پر تھی۔ لوگ گھر اور سامان چھوڑ کر اللہ کے راستے پر وطن عزیز کے لیے افغانستان پہنچنے لگے۔ مولانا احمد علی لاہوری (رحمۃ اللہ علیہ) عزیز ہندی، خان عبدالغفار خاں اور ان کے ساتھ ہزاروں مسلمان کابل پہنچ چکے تھے کہ ۱۱۔ جولائی ۱۹۲۰ء کو کراچی خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں مولانا حسین احمد مدنی نے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی۔

"حکومت برطانیہ کی فوج میں ملازمت کرنا، کسی کو بھرتی کروانا، کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین کرنا اور ہر قسم کی دوسری اعانت کرنا شرعاً حرام ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ یہ بات ہر مسلمان فوجی تک پہنچا دے۔"

یہ قرارداد منظور ہوتے ہی انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ شعلہ فشاں ہوئی۔ رہنماؤں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ کراچی کا مشہور مقدمہ چلا جس میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو شامل تھے۔ اس مقدمہ میں رہنماؤں کو دو دو اور تین تین برس قید کی سزائیں ہوئیں۔

اس وقت چالیس ہزار کے قریب مسلمان افغانستان جا چکے تھے۔ اور دوسری طرف ہندوستان کے جیل خانے عوام اور لیڈروں سے بھر چکے تھے۔ ملک کے اندر افراتفری کا عالم تھا۔ انگریزی قانون اپنی عافیت کے لیے ہر طرح لیس ہو کر غلاموں کے مقابلے پر صف آرا ہو چکا تھا۔

لوہے کی زنجیریں، بندوقوں کی سنگینیں، جیل خانوں کی کوٹھڑیاں، عدالتوں کے کٹہرے اور پھانسی کے رسے سب کے سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ غلام اور آقاؤں کے درمیان جنگ کے بادل اس تیزی کے ساتھ برسے کہ سارا ملک لہو سے داغدار ہو گیا۔ آسمان اور زمین کے درمیان خونِ بے گناہ کی لکیر کھنچ گئی جس کے دونوں جانب قانون فرنگی کے نخچیر تڑپتے نظر آنے لگے۔ راعی اور رعایا کے مابین اعتماد کی ساری گرہیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ قریب تھا کہ غلاموں کے ہاتھ آقاؤں کے گریبان تو چ ڈالتے اور تار گریبان کی دھجیاں اڑکر ایوانِ فرنگی پر برق بن کر گرتیں کہ فرنگی دانشوروں نے نئی نہج پر سوچنا شروع کیا اور تحریک ہجرت کی موت کے اسباب پر فکر و نظر کی طرح ڈالی۔

جیسے کہ اوپر بیان کیا گیا افغانستان ان دنوں ایک ایسی بساط تھی جس پر مختلف حکومتوں کے مہرے کام کر رہے تھے۔ ہر کھلاڑی اپنے داؤ پر تھا۔

ترکیہ، جرمنی اور روس، برطانیہ کے خلاف ایک محاذ پر جمع تھے۔ گو برطانیہ کے ہاتھ اپنی رعایا پر اٹھ رہے تھے لیکن اس کی نگاہیں اور کان افغانستان کے پہاڑوں پر مرکوز تھے جن کے دامن میں اس کی موت کے مشورے ہو رہے تھے۔

غازی امان اللہ نے ہندوستانی مہاجروں کو جس جذبے کے تحت دعوت دی تھی بلاشبہ وہ جذبہ ایک محبِ ملت مسلمان بادشاہ کا جذبہ تھا، جس میں خلوص کی سینکڑوں بہاریں جلوہ فرما تھیں لیکن افغانستان کے اقتصادی اور سیاسی حالات چالیس ہزار مہاجروں کے بوجھ کے متحمل نہیں تھے۔ انگلستان ان واقعات و حالات سے ناآشنا نہیں تھا۔ افغانستان کی اس کمزور اور ریتلی دیوار کا سہارا لے کر اس نے کابل کو ایک ایسی نظر سے دیکھا کہ غازی امان اللہ اپنے عزم کی سیڑھیوں سے پھسلتا دکھائی دیا۔

"اگر والیٔ افغانستان چاہے تو اس کا تمام ملک پابندیوں سے آزاد کر دیا جائے گا بشرطیکہ انگریزوں کے خلاف افغانستان سے غیر ملکی اڈے ختم کر دیے

جائیں اور ہندوستانی مہاجروں کو واپس کر دیا جائے۔"

افغانستان نے بغیر کسی تردد کے ۲۰ جون ۱۹۲۰ء کو انگریزوں کی یہ دونوں شرطیں منظور کرلیں۔ اگرچہ اس مسودے کی تصدیق انگلستان نے ۲۲ نومبر ۱۹۲۲ء کو دی لیکن حالات کی آنکھیں جون ۱۹۲۰ء سے سرخ ہونی شروع ہو چکی تھیں۔ جن مہاجروں کی آمد پر افغانستان فرشِ راہ تھا آج ان مہاجروں کے لیے کابل کے بام و در، کوچہ و بازار اپنا دامن سکیڑ رہے تھے۔ کل جن پہاڑوں نے پھول برسائے تھے آج انہیں پتھراؤ کرنا مشکل نہیں ہو رہا تھا۔ افغانستان کے دل و نگاہ میں کل کے مہمان آج کے مجرم تھے۔

افغانستان کے حکمران اور عوام کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر جرمنی، روس اور ترکیہ کے نمائندوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ وہ اپنے ہی بنائے ہوئے منصوبوں کو روندتے ہوئے اپنی چھوڑی ہوئی راہوں پر پلٹ گئے۔ مولانا عبیداللہ سندھی خود غازی امان اللہ کے تعاون سے روس پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

ان حالات میں تحریک ہجرت کے رہنماؤں کو اپنے ماضی پر غور کرنا اور قدم روکنے پڑے راستے کی تھکاوٹ محسوس ہونے لگی، حالات شرمندہ کر رہے تھے۔

اس مسافر کی محرومیٔ دل کا اندازہ کون کر سکتا ہے، جسے منزل پر پہنچ کر بھی منزل نہ ملے۔ وہ نگاہیں کتنی بدنصیب ہیں جنہیں آستانۂ یار پر جا کر بھی دیدار کی سعادت سے محروم رہنا پڑے۔

شاہ جی اور دوسرے زعمائے ملت جنہیں تحریک ہجرت کا خضرِ راہ کہا جا سکتا تھا، تحریک کی ناکامی اور چالیس ہزار مہاجر مسلمانوں کی کابل سے نامراد واپسی پر سکونِ دل کھو بیٹھے۔ دوستوں کے گلے اور دشمنوں کے طعنے نے شاہ جی کو دل برداشتہ کر دیا۔ اور وہ اپنی تمام سرگرمیاں چھوڑ کر پھر آزاد ہائی سکول کی دیکھ بھال کے لیے گجرات واپس چلے گئے۔

پہلی گر[illegible]

افغانستان کے خوف سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۵۔ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بدیشی مال کا بائیکاٹ اور فوجی بھرتی کے خلاف عام لڑائی کا اعلان کر دیا گیا۔

ہندوستان کی ان دونوں تحریکوں میں انگریزوں کو اپنی موت دکھائی دینے لگی۔ ہر شہر میں روزانہ ریشمی کپڑے بازاروں میں نذرِ آتش ہونے لگے۔ ہندو، مسلمان عورتیں اپنا قیمتی لباس خوشی سے جلانے کے لیے رضاکاروں کے سپرد کر دیتیں۔ مرد گرم کپڑوں کو اپنے ہاتھ سے آگ لگا دیتے۔

اس تحریک نے انگلستان کی ملوں اور کارخانوں کو معطل کر دیا۔ یورپین مال سے ایشیائی منڈیاں خالی ہو گئیں اور روزانہ ہزاروں کی تعداد میں رضاکار گرفتار ہونے لگے۔

سال ۱۹۲۰ء کی عمر اسی ہاہاکار میں تمام ہو گئی۔ اس سال کے غروب ہونے والے آفتاب کی زریں شفق کی سرخیوں پر ایک ایسا عنوان چھوڑ گئیں جس سے ظلم و جور کی سینکڑوں کہانیاں مرتب ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی اس سال کی کہانی ہے کہ افسانہ ہائے جرم و سزا کے رنگ و روغن کو کائنات کے دامن میں محفوظ کر لیا۔ تاریخ کے اوراق پریشان ہو کر بھی اس سال کے واقعات کو ضائع نہیں کر سکتے۔

۱۹۲۱ء کے شروع میں آزاد ہائی سکول میں پھر سے بہار آ گئی۔ شاہ جی نے دوسری جدوجہد سمیٹ کر سکول کی طرف توجہ دی۔ دلوں کے دروازوں پر از سر نو دستک سن کر عوام باہر نکلے۔ حالات پر خوف و ہراس کا عالم تھا۔ حکومت نے شاہ جی کی سیاسی سرگرمیوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ سکول کی نگرانی بھی شروع کر دی تھی۔ بظاہر سکول کی عمارت تعلیم تک محدود تھی لیکن حکومت کو ہر طالب علم کا بستہ خلافت کمیٹی کا دفتر معلوم ہوتا تھا۔

شاہ جی کی شخصیت اب امرتسر اور گجرات سے نکل کر راوی اور چناب کی لہروں پر تیرنے لگی۔ بیاس اور ستلج کی موجوں نے انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ پنجاب کی آب و ہوا نے شاہ جی کے مزاج میں نکھار پیدا کیا۔ پھول کی خوشبو نے چمن سے نکل کر گیسوئے یار کو بہار آفریں کر دیا۔

دہلی سے اٹک کے کنارے تک شاہ جی کے پرچے ہونے لگے۔ دل و نظر نے احترام نے

دوستوں کے حلقے کو وسعت دی۔ انہی دنوں شاہ جی کا سیاسی مزاج بھی پختہ ہوا اور ان کی تقریروں میں مذہب کے ساتھ برطانوی سامراج پر کھلی تنقید ہونے لگی۔ غلامی کا احساس جوان ہو کر حاکموں سے متصادم ہوا۔

خلافت اور ترک موالات کی تحریکات کے باعث انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں نفرت پھیل چکی تھی۔ انگریزوں کی فوج میں بھرتی کو شرعاً حرام قرار دیا جا چکا تھا۔ گجرات چونکہ افواجِ فرنگی کا مرکز تھا اس کی حفاظت سلطنت برطانیہ کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ لہٰذا شاہ جی کو باغی قرار دے کر ان کی سرکاری طور پر نگرانی میں لیل و نہار کی تمیز اٹھا دی گئی۔ انگریزی قانون شکاری کتے کی طرح ان کے نقشِ پا کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔

پنجاب خلافت کانفرنس منعقدہ ۱۸۔مارچ ۱۹۲۱ء راولپنڈی میں شاہ جی نے تقریر کی جو ۲۰۔مارچ کے "زمیندار" میں شائع ہوئی۔ یہ شاہ جی کی پہلی تقریر تھی جو اخبارات میں شائع ہوئی۔

"برادرانِ ملت! میں آج تقریر کرنے کے لیے نہیں آیا تھا، بلکہ آپ کی طرح سننے والوں میں سے تھا۔ سخت ہی تحیر اور تعصب کا مقام ہے کہ کوہاٹ کے جبہ پوش تو اس جلسہ میں شریک ہوں اور باشندگان راولپنڈی جلسے میں دکھائی نہ دیں۔ کیا ان میں نورِ ایمان زیادہ ہے؟ کیا وہی قرآن کریم پر عمل پیرا ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ عدالتوں میں تو اُلّو بول رہے ہیں۔ وکالت پیشہ احباب اپنی وکالت کیوں ترک کرنے لگے۔ دراصل وہاں کے باشندوں نے عدالتوں کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وکالت پیشہ احباب کو اپنی وکالت ترک کرنی پڑی۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنو۔ بدمستی چھوڑ دو۔ جن کے صدقے میں تمہیں آرام تھا وہ بے آرام ہیں۔ جن کی وجہ سے تم عیش و عشرت کرتے تھے وہ آج کل نہایت کس مپرسی کی حالت میں ہیں لیکن تم ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ تم ہی کوئی تجویز بتاؤ کہ ہم بھی تمہارے قائل ہو جائیں۔

ترکوں نے خلافت اسلامیہ کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا لیکن تم ہندوستانیوں پر قرآن اور کعبہ لعنت بھیجتا ہوگا۔ فرشتے ترکوں کو ذبح کرنے کیلئے آسمانوں سے نہیں اترے۔ حرمین شریفین کے ان محافظوں کو اگر قتل کیا تو تم نے ہندوستان میں سب سے بڑا مرکز راولپنڈی کا ضلع ہے، جس نے انگریزی فوج میں بھرتی دی۔ جنگی قرضے میں تم نے اپنا سب کچھ دے دیا۔ ارے تم میں تو اتنی غیرت بھی نہیں۔ اگر تمہاری لڑکیوں کو یورپین مانگیں تو تم ان کو بھی دینے پر آمادہ تھے۔ اب بھی تم مصطفیٰ کمال کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو۔ سفید خداؤں سے ڈرتے ہو۔ جس کعبہ کی طرف تم منہ کر کے نماز پڑھتے ہو، اسی پر ہاتھ صاف کرتے ہو۔ ارے تم میں تو شمہ بھر بھی غیرت نہیں۔ تم تماشا دیکھتے ہو گے کہ ابوالکلام آزاد محمد علی، شوکت علی جیل چلے جائیں تو کام بند ہو جائے گا۔ ارے آزادی کس چیز کا نام ہے، قید کس چیز کا نام ہے۔ قید اور آزادی میں کیا فرق ہے؟ اگر ہمارا گھر آزاد ہے تو ہم آزاد ہیں۔ اگر وہ آزاد نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ کیا ترک مٹ جائیں گے تو مکہ اور مدینہ کو بچا لو گے؟ کیا کالا غلاف جس میں اس وقت سوراخ ہے اسے بچا لوگے؟۔ ارے دیکھو! ترکوں کا جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ حرمین شریفین پر بھینٹ چڑھا دیا کرتے تھے۔

میں تم سے ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں ہم انشاءاللہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

(اس پر اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے)

تمہارے لیے سکھ اپنی جانیں دے رہے ہیں۔ غیر، نوحہ خوانی کر رہے ہیں لیکن تم ہو کہ شادمانی کر رہے ہو۔ تم کہتے ہو محمد علی نہیں آئے، شوکت علی نہیں آئے صدر صاحب نہیں آئے۔ ارے سنو اور غور سے سنو! کہ اللہ ہمارا صدر ہے اور قرآن کریم ہمارا دستور العمل ہے۔ تمہارا قافلہ بہت دور جا چکا ہے اور تم پھر اس

قافلے کو واپس لا رہے ہو جہاں سے چلا ہے۔ تم اللہ کی مدد نہ کرو گے۔ اللہ تم پر عذاب نازل کرے گا۔ تمہارا دل پتھر کا ٹکڑا ہے گوشت کا لوتھڑا نہیں۔ اگر تم ان باتوں سے منحرف ہو تو نیا خدا بنا لو۔ نیا قرآن لے آؤ۔ تم اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہو تو میرے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ تمہارے نعرے بے روح ہیں۔

مولوی ظفر علی خاں، مولانا فاخر، مولوی لقاء اللہ کے لیے تم نے کیا کیا؟ تم نے ان سے کون سی ہمدردی کی؟ تمہارے مولوی تو سی آئی ڈی کے اندر موجود ہیں۔ تم نے ہی ان تک اطلاعیں بھجوائیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں دیکھ لیتا کہ انگلستان یا آئرلینڈ کے لوگ اس قسم کی اطلاعوں کو پہنچانے میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔

تم نے مولانا محمود الحسن کے کہنے پر عمل کیا؟ اس بزرگ کے اقوال کا اتباع کہاں تک کیا؟ ارے مسلمانو! تمہاری اس حالت پر مجھے افسوس آتا ہے اور حسرت بھی۔ مجھے سیال شریف کے پیر ضیاء الدین سے پچھلے دنوں ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس نیک بخت بزرگ نے اپنے مریدوں کے نام یہ حکم صادر فرمایا ہے "کہ جو شخص میری حلقہ مریدی میں رہنا چاہتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ افواج یا گورنمنٹ انگلشیہ کی نوکری ترک کر دے، ورنہ وہ میرا مرید نہ ہو گا۔"

اخبارات کے ذریعے عوام میں ابھی اس تقریر کے چرچے ہو ہی رہے تھے کہ ۲۵۔ مارچ کو نماز جمعہ کے بعد امرتسر خلافت کمیٹی کے جلسہ عام میں جو خیر الدین کی مسجد میں ہوا۔ شاہ جی نے دوسری تقریر کی۔ اس تقریر کے بعد حکومت نے شاہ جی کو مزید ڈھیل دینا نامناسب سمجھا اور ۲۷ مارچ ۱۹۲۱ء کو رات دو اور تین بجے کے درمیان کوچہ موہر کنداں کرموں ڈیوڑھی امرتسر سے دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت گرفتار کر لیا۔

شاہ جی ان دنوں گجرات سے اپنی ہمشیرہ[1] کی شادی کے سلسلے میں امرتسر آئے ہوئے تھے۔

---

[1] ۔ شاہ جی کی یہ ہمشیرہ باپ کی طرف سے حقیقی اور والدہ کی طرف سے سوتیلی تھی لیکن شاہ جی ان سے ہمیشہ حقیقی بہنوں کا سا پیار کرتے

امرتسر میں ہڑتال طلوع آفتاب سے پیشتر سارے شہر میں شاہ جی کی گرفتاری کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دکانیں کھلنے سے پہلے بند ہونے لگیں۔ گلی کوچوں نے ماتمی لباس پہن لیا۔ گھروں میں جلتے ہوئے چولہوں کی آگ سرد کر دی گئی۔ یہاں تک کہ سارا شہر امڈ کر کوتوالی آن پہنچا۔ حکومت برطانیہ مردہ باد! سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد! کے پیہم نعروں نے پولیس افسروں کو مجبور کر دیا کہ وہ عوام کی مرضی دریافت کریں۔ "ہم شاہ صاحب سے ملنا چاہتے ہیں یا انہیں ہمارے سامنے لاؤ"!

ہجوم کا یہ مطالبہ افسرانِ بالا تک پہنچا۔ آخر طے پایا کہ ہجوم اپنے چند آدمی منتخب کرے۔ چنانچہ ۵ ہندو ۵ مسلمان کوتوالی کے اندر حوالات میں شاہ جی سے ملنے گئے۔ واپسی پر ان کا بیان ہے کہ "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شیر کچھار میں ٹہل رہا ہے۔ انہیں اپنی گرفتاری کا ذرہ برابر خوف نہیں۔ چہرہ اسی طرح سُرخ اور آنکھیں اسی طرح مسکرا رہی ہیں۔ زبان پر قرآن کریم کی آیات جاری ہیں"۔

ہم نے ضمانت کے لیے عرض کیا تو ناراض ہو کر فرمانے لگے "آپ نے مجھے بزدل یا وطن کا غدار سمجھا ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا اگر آپ نے ایسا کیا تو میں کوتوالی سے باہر آتے ہی وہی کچھ کروں گا جس کی وجہ سے میں یہاں لایا گیا ہوں۔

پھر شاہ جی کے والد ملنے آئے تو دیکھا "سورۂ یوسف" کی تلاوت کر رہے ہیں۔ حوالات کے آس پاس پولیس افسروں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ والد صاحب کو دیکھ کر شاہ جی نے "السلام علیکم" کہا۔ والد صاحب نے جواب میں "وعلیکم السلام" کے بعد کہا،

"میں اس دن کا منتظر تھا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں استقامت دے۔ آمین"!

پھر شاہ جی نے کہا،

"ابا جی! میں آپ کی دعائیں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتا ہوں اور بس"!

گرفتاری کی خبر جب دوسرے شہروں میں پہنچی تو ہر جگہ برطانوی حکومت کے خلاف جلسے

ہوئے ۔ شاہ جی کو حق گوئی کی پاداش میں گرفتاری پر مبارک باد کی قرار دادیں منظور کی گئیں۔

تحریکاتِ آزادئ وطن کے چلتے ہوئے الاؤ میں شاہ جی کی گرفتاری نے ایسا تیل چھڑکا کہ اس آگ کے شعلے ایوانِ فرنگی تک جا پہنچے جس سے غلامی کی زنجیریں پگھلنے لگیں۔ ان دنوں شاہ جی کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔

مقدمہ کی سماعت

۲۔ اپریل ۱۹۲۱ء پہلی دفعہ شاہ جی کو مسٹر ایف اے کانر (F.A. CANER) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ کچہری میں عوام کی اس قدر بھیڑ تھی کہ باقی عدالتوں کو اپنا کام جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ دس بجے سے ذرا بعد شاہ جی کو پولیس کی لاری میں کچہری لایا گیا۔ شاہ جی کو دیکھتے ہی عوام نے برطانوی راج مردہ باد کے نعرے لگائے۔ انتظام کے لیے گورکھا فوج کا دستہ پہلے سے متعین تھا لیکن ان دنوں عوام کے جذبات فوج اور پولیس کے رعب سے بے نیاز تھے۔ عدالت کا کمرہ وکلاء اور دوسرے معززین سے بھرا پڑا تھا۔

مجسٹریٹ۔ (شاہ جی سے مخاطب ہو کر) آپ نے ۲۵۔ مارچ کو خیرالدین کی مسجد میں تقریر کی تھی؟

شاہ جی ۔ میں نے وہاں بھی قرآن کریم پڑھا تھا اور یہاں بھی قرآن کریم کی ایک آیت پڑھتا ہوں۔

مجسٹریٹ ۔ آپ لکھ کر دے دیں۔

شاہ جی ۔ جس نے وہاں میرا قرآن نوٹ کیا ہے وہی لکھے۔ اگر یہاں درست نہیں نوٹ کر سکتے تو وہاں کس نے درست نوٹ کیا ہو گا۔ میں لکھنا نہیں جانتا پڑھنا جانتا ہوں۔

مجسٹریٹ ۔ آپ کا بیان؟

شاہ جی ۔ میرا بیان وہی ہے۔

سرکاری وکیل نے استغاثہ پڑھ کر سنایا۔

"مولوی عطا اللہ صاحب ایک ذی عزت آدمی ہیں۔ آپ کے والد بھی ذی عزت آدمی ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ جو لفظ میرے منہ سے نکلتے ہیں۔ ان کا اثر ہو گا۔ ان کو

علم تھا کہ ایسی تقریروں کا کیا اثر ہوتا ہے۔

پہلے بھی ان کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایسی تقریروں سے منع کیا تھا۔ یہ تقریر جو انہوں نے جمعہ کے دن وعظ کی صورت میں کی تھی۔ قرآن شریف کی آڑ میں انہوں نے اپنی سیاسی خواہش کو پورا کرنا چاہا تھا۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس سے ان لوگوں کے دلوں میں جو سننے والے تھے برے خیالات پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

انہوں نے مسجد میں قسم کھا کر کہا کہ مکہ معظمہ پر گولیاں چلائی گئیں۔ اس طرح ان لوگوں کے دلوں میں مذہبی نفرت اور جوش پیدا کیا گیا۔

انہوں نے کہا کہ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی اور وہ بطور راشن کے سپاہیوں کو دی گئیں۔ دس دس آدمیوں کو ایک عورت دی گئی اور ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں عورت کی عزت و حرمت بہت بڑی ہے۔

انہوں نے کہا جو روپیہ لڑائی کے لیے ہم سے لیا گیا اس سے گولیاں خریدی گئیں اور ہمارے اپنے بھائی ان سے مارے گئے۔

یہ ایسی تقریر تھی جو بے علم لوگوں پر جن کو واقفیت نہ ہو ان پر برا اثر کر سکتی تھی اور گورنمنٹ کے خلاف تھی۔

جب شاہ جی وعظ کے طور پر جمعہ میں یہ لفظ کہہ رہے تھے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مبالغہ قابل معافی اور جھوٹ بولنا واجب اور جائز ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ وہ کس قسم کے آدمیوں کو سنا رہے ہیں۔ ایسی بات سن کر وہ فساد کرنے لگتے ہیں جس سے حکومت کے خلاف بغاوت کا احتمال ہے۔

لہٰذا حسب ذیل امور اس تقریر میں جرم تحت ۱۲۴۔ الف تعزیرات ہند عائد ہوتے ہیں۔

۱۔۔۔۔ فرعون اور حکومت کے مابین مقابلہ کیا گیا۔ یہ کہ انگریز چاہتے ہیں کہ کل

دنیا کو عیسائی بنائیں۔ "انگریز" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ "یہ برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کے لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ لارڈ کچز وغیرہ کا ذکر کیا گیا۔

۲ ـــــــ موسیٰؑ اور فرعون کا ذکر کیا گیا۔ موسیٰؑ نے فرعون کی سلطنت کو تباہ کر دیا تھا۔ وہ بچوں کو قتل کرتا تھا۔ یہ حکومت طریقہ تعلیم سے وہی بات کرتی ہے۔

۳ ـــــــ پولیس والے نو نو روپے لے کر اپنے بھائیوں کے گلے کاٹتے ہیں۔ فرعون کے مخبر بھی تھے لیکن انہیں تنخواہ زیادہ ملتی تھی۔ موسیٰؑ نے ایک شخص کو مارا۔ خدا کو غصہ پسند ہے۔ سرخ رنگ، سرخ چہرے، سرخ کپڑے بھی خدا پسند کرتا ہے۔ میری تعلیم بھی یہی بتاتی ہے کہ سرخ کپڑے ہوں اور میں حسینؑ کی گود میں چلا جاؤں۔

۴ ـــــــ ہمارے بھائی برطانوی فوج میں بھرتی ہو کر مدینہ منورہ گئے اور اپنے ہی بھائیوں کو مارا۔ خانہ کعبہ کے غلاف میں چھید کیے۔ حج کے لیے غربت کا عذر پیش کیا جاتا ہے لیکن مذکورہ بالا کام قلیل تنخواہ پر کر رہے ہیں۔

۵ ـــــــ زنانہ مدارس لڑکیوں کو تباہ کرتے ہیں۔ چائے، انڈے اور انگور کھلا کر خراب کرتے ہیں۔ وہ گھر کے کام کے قابل نہیں رہتیں۔ وہ بے شرم ہو جاتی ہیں۔ ملیشیا میں عورتوں کو راشن کے طور پر تقسیم کیا گیا۔

۶ ـــــــ انگریز مکھیوں کی طرح ہیں۔ اگر تم ان سے لڑو گے تو وہ تمہیں ڈنک ماریں گی۔ ان کو ہڑتال کی دھونی دو اور اس طرح وہ بوریا اٹھا کر چل دیں گے اور بمبئی کی بندرگاہ سے سوار ہو کر چلے جائیں گے اور ہم کنارے پر کھڑے ہو کر غرق ہونے کی دعا کریں گے اور شہد کھائیں گے۔

۷ ـــــــ افسوس ہے کہ ہمارے بچے ابھی تک انجمن اسلامیہ کے سکول میں پڑھتے ہیں جس نے کچھ ہزار روپیہ انگریزوں کو دیا جس سے گولیاں خریدی گئیں اور یہ

۸ ـــــــــ انگریزوں نے جس طرح دباؤ میں رکھنا چاہا بھرتی کیا، لڑائی میں مروایا جلیانوالہ باغ میں گولیاں چلائیں، قید کیا، پھانسیاں دیں، لڑائی کا چندہ لے کر ہم کو لوٹ لیا۔ چونکہ سڑلیشن میٹنگ ایکٹ (STRATION MEETING ACT) نافذ ہے، مسجد ہی امن کی جگہ ہے۔

۹ ـــــــــ منتروں وغیرہ کا حوالہ دیتے ہوئے ملزم نے انگریزوں کو شیطان کی نانیاں کہا ہے۔

یہ تمام الفاظ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۴۔ا کی زد میں آتے ہیں۔

فردِ جرم

مجسٹریٹ ۔ (شاہ جی سے) آپ نے ۲۵۔ مارچ کو ایک تقریر کی جس کی رپورٹ A.B.C. میں درج ہے کہ آپ نے حکومت کے خلاف نفرت یا حقارت پیدا کی یا اس کا اقدام کیا یا دشمنی کے خیالات پھیلائے اور برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کے خلاف لوگوں کے دلوں میں حقارت پیدا کی۔ کیا آپ نے یہ جرم کیا ہے ؟

شاہ جی ۔ میں نے جرم ہرگز نہیں کیا۔ قرآن کریم پڑھا ہے، قرآن کریم پڑھنا جرم نہیں۔

مجسٹریٹ ۔ جرح کے، یہ گواہ بلانے ہیں یا صفائی کے گواہ۔

شاہ جی ۔ میں ترکِ موالات کا حامی ہوں۔ قرآن میری صفائی ہے۔ قرآن میرا گواہ ہے۔ قرآن ہی میرا مذہب ہے اور قرآن ہی میرا دین۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

فیصلہ مقدّمہ

مقدمے کی یہ کاروائی مسلسل جاری رہی۔ آخر ۸۔ اپریل ۱۹۲۱ء کو حسب ذیل فیصلہ دیا گیا۔

" قیصر ہند بنام مولوی عطاءاللہ ولد حافظ ضیاءالدین، قوم سید، سکنہ ناگڑیاں جرم زیر دفعہ ۱۲۴ الف مجموعہ تعزیرات ہند۔ تاریخ اجراء مقدمہ ۲۔ اپریل ۱۹۲۱ء

اس مقدمہ میں امرتسر شہر کا ایک مولوی عطاءاللہ ملزم ہے۔ یہ شخص زیر دفعہ ۱۲۴۔ا تعزیرات ہند ایک وعظ کی بناء پر گرفتار کیا گیا ہے، جو اس نے شیخ

خیرالدین کی مسجد واقع ہال بازار امرتسر بروز جمعہ مورخہ ۲۵۔مارچ ۱۹۲۱ء کو کثیرالتعداد جماعت کے سامنے بیان کی۔استغاثہ کا بیان ہے کہ اس وعظ سے اس حکومت کے خلاف جو بروئے قانون قائم ہے، نفرت اور حقارت پھیلنے کا احتمال ہے۔

یہ استغاثہ حکومت کی منظوری لینے کے بعد دائر کیا گیا۔استغاثہ کے دس گواہوں نے یہ وعظ سنا۔ان میں سے ایک غلام محی الدین ہیڈ کانسٹیبل گواہ استغاثہ نمبر۴ تھا۔جو وعظ سننے کے بعد کوتوالی پہنچا اور اس نے وعظ کے نوٹ تیار کر کے اپنے حکام کے پاس بھیجے۔وعظ کا ترجمہ مختصر درج ذیل ہے۔

ا ـــــ ہندوستان کی موجودہ حکومت کا مقابلہ فرعون سے کیا گیا اور مسٹر گاندھی کی مثال موسیٰؑ سے دی گئی۔فرعون کی سلطنت برطانیہ کی نسبت بڑی اور طاقتور تھی۔فرعون منجموں سے صلاح اور مشورے کیا کرتا تھا اور انگریز ڈاکٹروں سے مشورے لیتے ہیں۔اگر ڈاکٹر اتنا کہہ دے کہ فلاں جگہ رہنا صحت کے لیے مضر ہے تو انگریز اس جگہ کو چھوڑ دیتا ہے۔خدا، انگلستان میں کوئی ایسا ڈاکٹر پیدا کر دے جو ہندوستان سے تین چار لاکھ روپیہ لے کر انگریزوں کو یہ مشورہ دے کہ ہندوستان کی آب و ہوا ان کے لیے ٹھیک نہیں۔

ب ـــــ فرعون تو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ کائنات کا خدا ہے اور انگریز یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں امن و امان پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ تمام نسلِ انسانی کو عیسائی بنا لیا جائے۔

ج ـــــ ان انگریزوں کے صلاح کار۔لارڈ جارج، کمشنر، گورنر اور اسی طرح کے دوسرے لوگ ہیں۔

د ـــــ فرعون کے منجموں نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک لڑکا پیدا ہوگا جو فرعون کی سلطنت کو تباہ کر دے گا۔اس پر فرعون نے موسیٰؑ کو تباہ کرنے کے لیے

یہ تجویز سوچی کہ جو لڑکا پیدا ہو اسے مار ڈالا جائے۔ فراعنہ یورپ (ہندوستان کی انگریزی حکومت سے مراد) نے اخلاق کو تباہ کرنے اور غلام بنانے والے نظامِ تعلیم سے ہندوستانیوں کی قومی روح اور مذہبی سرگرمی کو برباد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بھائیوں نے نو نو روپے کی ذلیل تنخواہ پر فوج میں بھرتی ہو کر مکہ اور مدینہ میں نیز خانہ کعبہ میں اپنے ہی بھائیوں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کیا لیکن جب حج کا سوال پیدا ہو تو مفلسی اور ناداری کا سوال پیش کرتے ہیں۔

لڑکیوں کے لیے سکول کھول رکھے ہیں۔ یہ سیاہ منتیں (شیطان کی نانیاں) سفید لباس میں دیہات کی لڑکیوں کو انگور کھلاتی ہیں اور لپٹن کی چائے پلاتی ہیں اور لپٹن کی لپیٹ میں لا کر گھر کے کام کاج کے ناقابل بنا دیتی ہیں یہاں کی ابتدائی تعلیم اور کالج کی پڑھائی انسان کو غلام بنا دیتی ہے۔ یورپ کا فرعون ہندوستانی عورتوں کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تاکہ ان کی اولاد غلام بنی رہے۔

ایشیا میں ہماری عزت و حرمت کو اس طرح ذلیل کیا گیا کہ ایک ایک مسلمان عورت دس دس سپاہیوں کو راشن کی طرح تقسیم کی گئی۔

۱۳ —— فرعون کو خبر نہ تھی کہ وہ بچہ جس کی تباہی کو اس نے اپنا مقصد قرار دے رکھا ہے خود اسی کے محل میں پرورش پائے گا۔ اور اس کی داڑھی نوچے گا۔ اسی طرح مہاتما گاندھی بھی برطانوی ہند میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی، یہیں کے تعلیمی اعزازات حاصل کیے۔ اب انگریزوں کو ہی برباد کرنے پر کمربستہ ہیں۔

س —— فرعون نے سی۔ آئی۔ ڈی کی مدد سے ایک ایسی دایہ تلاش کی جسے شیر خوار نے پسند کیا۔ موجودہ سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی نو روپے کی ذلیل رقم کے لیے اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹتے ہیں۔ خدا کرے ان کے ہاتھوں میں جذام

ہو جائے۔ قیامت کے دن ان کا سیاہ نامۂ اعمال ان کی گردنوں میں لٹکایا جائے گا۔ (اس موقع پر پولیس کے ان سفید پوش آدمیوں کی طرف اشارہ کیا، جو اس وقت مجمع میں موجود تھے) اگر یہ لوگ اس قسم کا کام چھوڑ دیں تو انگریزوں کو یہی کام خود کرنا پڑے۔

ش ـــــ جب موسیٰ جوان ہوئے تو انہوں نے ایک مصری کو جوشِ جلالت میں مار ڈالا۔ خدا ایسے جلال کو پسند کرتا ہے۔ خدا سُرخ رنگ، سُرخ کپڑے، سُرخ چہرے اور سُرخ گریبان پر خوش ہوتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ میں بھی اپنے کپڑوں پر سرخ چھینٹے دیکھوں تاکہ مجھے جنت الفردوس میں جگہ ملے۔

ملزم کے وعظ میں مندرجہ ذیل اشارات بھی تھے۔

ا ـــــ جرمنوں نے چالیس سال تک جنگ کی تیاری کر کے بالآخر شکست کھائی۔ کاش! انگریزوں کو بھی کسی کے ہاتھوں شکست کھانی پڑے۔ ہندوستانی جرمنوں کی طرح جنگ کی تیاری نہیں کر سکتے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ ناک دھونی کا طرزِ عمل اختیار کریں۔ انگریز شہد کی مکھیوں کی مانند ہیں۔ ان پر کوئی چیز نہ پھینکو ورنہ یہ مکھیاں کاٹنے دوڑیں گی۔ اگر تمہارے چہرے پر بیٹھ جائیں تو انہیں ہٹا سکتے ہو اور دو ایک کو مار بھی سکتے ہو۔ لیکن یہ بڑی طاقتور ہوتی ہیں۔ انسان کا خون پی لیتی ہیں۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انہیں عدم تعاون اور ہڑتال کی دھونی دو۔ بس پھر یہ اپنا بوریہ بستر باندھ کر بمبئی سے روانہ ہو جائیں گے اور ہم کہیں گے۔ غرقنا آلِ فرعون

۲ ـــــ اگر ہندوستانی صرف کھدر کا کپڑا پہننا شروع کر دیں تو انگریزوں کا دیوالہ نکل جائے۔

۳ ـــــ نہایت افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کے بچے اب تک

انجمن اسلامیہ کے سکول میں جاتے ہیں حالانکہ اس انجمن نے سرمایہ جنگ میں پچھتر ہزار روپیہ دیا تھا تاکہ اس روپے سے گولیاں خریدی جائیں جو کہ مسلمانوں ہی کے سینے چھلنی کریں۔

۴ —— انگریزوں نے ہر ممکن طریق سے ہندوستانیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے فوج میں بھرتی کر لیے گئے تاکہ مارے جائیں بعض جلیانوالہ باغ میں ذبح کر دیے گئے۔ بعض مارشل لا میں قید کر دیے گئے اور پھانسی پر لٹکائے گئے، جو باقی رہ گئے ان کا مال و متاع جنگ کے لیے لوٹ لیا گیا اور انہیں افلاس کے گڑھے میں پھینک دیا۔

۵ —— جب سے قانون امتناع مجالس باغیانہ نافذ ہوا ہے صرف مسجد ہی ایک مقامِ امن ہے۔ لہٰذا عوام کو چاہیے کہ مسجدوں کی مرمت کے لیے دل کھول کر چندہ دیں۔

یہ اقتباسات کافی ہوں گے۔ میرے روبرو ملزم نے بیان کیا ہے کہ اس نے محض قرآن کریم پڑھا ہے۔ ملزم نے کوئی جواب استغاثہ کو اس بنا پر پیش نہیں کیا کہ وہ عدم تعاون کا پابند ہے۔

فیصلہ کے لیے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا ملزم نے یہ وعظ کہا تھا جو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ گواہانِ استغاثہ نے جو کچھ سنا اس کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنے میں ان کا کوئی مقصد نہیں اور جس طریق میں انہوں نے اپنے بیانات دیے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دانستہ ایک ناگوار فرض انجام دے رہے ہیں۔ گواہ استغاثہ نمبر ا مولوی نور احمد نے جو ملزم کا ہم پیشہ مولوی بھی ہے، حتی الامکان ملزم کو مدد دینے کی کوشش کی اور اس واقعہ پر از خود زور دیا کہ سامعین کی جماعت دورانِ وعظ جوش سے بھری معلوم نہ ہوتی تھی لیکن

یہ امر خارج از بحث ہے کیونکہ جرم زیر غور یہ نہیں کہ تقریر کا اثر کیا ہوا بلکہ سوال یہ ہے کہ الفاظ سے کس قسم کا جذبہ پیدا کرنا مقصود تھا۔ گواہ مذکور اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ سامعین مولوی عطا اللہ کا وعظ توجہ سے سن رہے تھے۔ ملزم نے قرآن کریم سے چند آیات پڑھیں اور حاضرین مسجد کو اس کی تشریح اور تفسیر کر کے سنائی۔ گواہ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وعظ کا مضمون فرعون اور موسیٰؑ سے متعلق تھا۔ نیز ملزم نے کہا تھا کہ مہاتما گاندھی کا نام بھی موسیٰؑ کی طرح میم سے شروع ہوتا ہے۔ گواہ نے تسلیم کیا کہ ملزم نے حکومت کا مقابلہ شہد کی مکھیوں سے کیا تھا۔ گواہ نے سودیشی دھوتی کے الفاظ بھی سنے ہیں اس کے علاوہ گواہ مذکور نے ڈاکٹروں کی رشوت کے متعلق بھی کچھ سنا تھا۔ گواہ نے یہ خود بیان کیا ہے کہ اس نے کوئی ایسی بات نہیں سنی جس سے بد نظمی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ لیکن ساتھ ہی گواہ نے بیان کیا کہ وہ ملحق کمرے میں پچھلی طرف بیٹھا تھا اور وعظ کے پہلے حصے میں موجود نہ تھا۔ سب سے آخر میں وہ کہتا ہے میں بیمار ہوں اور میری طاقتِ سماعت کمزور ہے۔ اس کا بیان دورانِ تحقیقات اوّل درجہ کے مجسٹریٹ نے قلم بند کیا تھا۔ وہ کہتا ہے میں انگریزوں کا لفظ زبان پر نہیں لایا ہوں۔ جیسے کہ بیان مذکور میں درج ہے وہ بیان صحیح ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس بیان میں گواہ نے کہا کہ ملزم نے فرعون کے ہمراہیوں کی غرقابی کا تذکرہ کیا۔ مگر چونکہ گواہ مولوی ہے یہ قدرتی بات ہے کہ اسے اس قسم کی شہادت خلاف مرضی دینی پڑی ہو اور ممکن ہے اسے ڈرایا دھمکایا بھی گیا ہو۔ چونکہ وہ وعظ میں موجود تھا، استغاثہ نے مناسب نہیں سمجھا کہ اسے شہادت میں پیش نہ کرے۔ شہادت دیتے ہوئے اسے جو روحانی کوفت ہوئی وہ بھی اس طرزِ عمل اور اس بات سے بخوبی ظاہر تھی کہ اس نے کئی مرتبہ برقاب کے جوتے پہنے اور گواہوں کے کٹہرے میں ایک خادم بھی ساتھ رکھا۔ یہ حالت نیز گواہ کا یہ عذر کہ میری سماعت میں فرق ہے۔ میں بیمار ہوں اور مسجد میں دیر سے

پہنچا تھا، بہت کچھ معنی خیز ہیں۔

میں بلا تامل اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملزم نے اسی طرح وعظ کیا جس طرح سے نقشہ جات ای، بی، اور سی میں درج ہے اور گواہانِ استغاثہ نمبر ۲ سے دس تک نے بیان کیا۔ پس یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا تصفیہ طلب امر یہ ہے کہ ملزم نے جو کلمات کہے وہ باغیانہ ہیں یا نہیں۔ ان سے نفرت و حقارت کے جذبات پھیلتے ہیں یا نہیں؟ ان سے اُس حکومت کے خلاف جو بروئے آئین برطانیہ، ہند میں قائم ہو چکی ہے بددلی پھیلتی ہے یا نہیں؟ وہ جذبات نفرت و حقارت جو برانگیختہ کیے گئے بغیر حکومت پر معقول نکتہ چینی کی حد میں آ سکتے ہیں یا نہیں؟ فرعون کے ہاتھوں بچوں کے اتلاف کا جو مقابلہ حکومت کے مروجہ طرزِ تعلیم کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے بظاہر حکومت کی حقارت مقصود ہے۔ پھر اس کا یہ کہنا کہ انجمن نے سرمایہ جنگ میں جو چندہ دیا تھا اس سے گولی یا بارود خرید کر ہمارے بھائیوں کو ہلاک کیا گیا اور مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی کی گئی۔ اس غلط بیانی اور دروغ بیانی کی مثال ہے جو اس شخص نے مذہب کی آڑ میں منبر سے تلقین کی تاکہ حکومت کے خلاف نفرت اور بددلی پھیلائی جائے۔ اس طرح وہ اپنے مسلمان سامعین سے استدعا کرتا ہے جن کے نزدیک عورت کی عزت اور حرمت سب چیزوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس غلط بیانی سے کام لیتا ہے کہ ہندوستانی عورتوں کے اخلاق بگڑتے جا رہے ہیں تاکہ ان کی اولاد حلقہ بگوش عیسائیت ہو۔

کہہ رہا تھا، اس لیے وہ یہ عذر بھی پیش نہیں کر سکتا کہ مبالغہ قابل عفو اور دروغ بیانی
جائز ہوتی ہے۔

پولیس کے متعلق بھی اس کے الفاظ عیاں طور پر ایسے ہیں جس سے پولیس
کے دلوں میں حکومت کی طرف سے بددلی پھیل سکتی ہے اور اس کا اثر خود
غلام محی الدین ہیڈ کانسٹیبل نے محسوس کیا ہے پھر اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش
کی کہ حکومت ہر ممکن ذرائع سے ہندوستانیوں کا استیصال چاہتی ہے یعنی ان
کے مروانے کے لیے فوج میں بھرتی کرتی ہے۔ جلیانوالہ باغ میں کشت و خون
گرم کرتی ہے، مارشل لا کے تحت قید کرتی ہے، پھانسیاں دیتی ہے اور
روپے پیسے سے محروم کرتی ہے۔

یہ باتیں بھی صریحاً غلط بیان کی گئی ہیں جن سے حکومت کے خلاف
نفرت اور بددلی پیدا کرنا اور سامعین کو عمل کے لیے ابھارنا مقصود ہے۔

مسٹر گاندھی اور موسیٰؑ کے تقابل سے متعلق اس شرمناک اشارے کی بابت
کچھ لکھنا غیر ضروری ہے جس سے اس نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے
کہ مسٹر گاندھی کس طرح حکومت کو دق اور پریشان کر رہا ہے۔ یاد رکھنے کے قابل
بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ موسیٰؑ کا ایک
مصری کو مار ڈالنا اور سرخ رنگ کا حوالہ دینا صاف طور پر خونریزی اور اشتعال انگیزی
کی طرف اشارہ ہے اور اس کے وعظ کے دوسرے مضمون کی طرح یہ باتیں بھی اس ملک
کی موجودہ حکومت کے خلاف کہی گئی ہیں۔ اس کی یہ آرزو کہ انگریزوں کو جرمنوں کی
طرح شکست ہو اور "اغرقنا آل فرعون" کی بددعا جو بقول ملزم کے اس وقت
زبان پر لائی جائے جس وقت انگریز ساحلِ ہند سے روانہ ہوں گے، حقارت اور
بددلی کی حقیقی مثالیں ہیں جو اس نے سامعین کے دلوں میں پیدا کیں۔

ملزم کا اپنے برادرانِ دین کو یہ ملامت کرنا کہ جب حج کے لیے کہا جاتا ہے تو غربت کا عذر پیش کرتے ہو حالانکہ ملزم نے خود حج نہیں کیا۔

اپنے بھائیوں کے ساتھ خلوص کی ایک اور مثال وہی ہے۔ اس کا مرمت مسجد کے لیے چندے کی درخواست کرنا جس میں وہ خود وعظ کر رہا تھا۔ اور یہ کہنا کہ قانونِ مجالس باغیانہ کی وجہ سے مسجد ہی ایک پناہ کی جگہ رہ گئی ہے ظاہر کرتا ہے کہ وہ قرآن شریف کی تعلیمات کو سیاسی اغراض کے لیے برت رہا ہے اور یہی نیّت اس کی اس کے وعظ سے مترشح ہوتی ہے۔ تخیّل کو خواہ کتنی ہی وسعت کیوں نہ دیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ملزم کا وعظ محض سوراج کے حصول کی خواہش پر مبنی تھا اور نہ ملزم نے خود اس کی طرف اشارہ کیا۔

چنانچہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ملزم نے جو تقریر کی ہے اس سے ایک ایسی حکومت کے خلاف جو برطانوی ہند میں بروئے قانون قائم ہو چکی ہے نفرت، حقارت اور بددلی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وعظ مذکور حکومت یا کسی سرکاری افسر کے خاص فعل یا کارروائی کے خلاف نہ تھا بلکہ اس کے ذریعے سے کوشش کی گئی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں اس نظامِ ترکیبی کے خلاف نفرت پیدا کی جائے جس کے تحت وہ رہتے ہیں اور اسے بدل دیا جائے۔

موجودہ نازک ساعت میں مذہب کے نام سے ایک غیر تعلیم یافتہ اور اشتعال انگیز مجمع کے سامنے کوئی تقریر کرنا ایسا ہے کہ اس سے بحیثیت مجموعی دلوں میں ایسی تلخی پیدا ہو سکتی ہے اور ایسے جذبات برانگیختہ ہو سکتے ہیں کہ لوگ فوراً عملی کارروائی شروع کر دیں۔

سامعین میں سے اگر کوئی شخص ملزم کا وعظ سننے کے بعد باہر آتا اور پہلا انگریز جو اسے ملتا اس پر وہ سر بازار حملہ کر دیتا تو یہ امر چنداں باعثِ تعجب نہ تھا

میں بلا تامل ملزم کو زیر دفعہ ۱۲۴ا و تعزیرات ہند مجرم قرار دیتا ہوں۔ جون
۱۹۲۰ء میں اسے تنبیہہ ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ اس قسم کی تقریر کرنے کے نتائج و
عواقب اور سزا سے بخوبی آگاہ تھا۔ قانون کی رو سے زیادہ سے زیادہ سزا
حبس دوام عبور دریائے شور ہو سکتی ہے لیکن میں ملزم کو تین سال قید بامشقت
کی سزا دیتا ہوں جس میں تین ماہ کی قید تنہائی ہو گی۔

دستخط ——— ایف۔ اے۔ کانر

۸۔ اپریل ۱۹۲۱ء ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

عدالت کا فیصلہ سننے کے بعد شاہ جی نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے
فی البدیہہ کہا سے

دار کے حق دار کو قید سہ سالہ ملے
ہائے مشکل آساں ہوتے ہوتے رہ گئی

کمرہ عدالت سے باہر نکلے تو ہجوم میں سے اکثر احباب کے رونے کی آواز
آئی۔ شاہ جی نے غصے میں آکر کہا۔

"کون بزدل رو رہا ہے؟ تعلق بخاری سے اور رونا عورتوں کی طرح۔
چپکے کہیں کے"

اس کے بعد السلام علیکم کہا اور پولیس کی لاری میں سوار ہو گئے۔

امرتسر جیل سے روانگی

۱۱ اپریل کو حسب دستور ڈسٹرکٹ جیل امرتسر سے شاہ جی کو لاہور سنٹرل جیل میں تبدیلی کا حکم ملا۔ یہ کام پولیس اور دوسرے حکام نے بڑی رازداری سے کرنا چاہا لیکن نہ جانے اہل شہر کو کس طرح پتہ چل گیا کہ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ

لایا گیا۔ پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑی۔ اس حالت میں یہ مرد درویش جب اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تو پتھر بھی آبدیدہ ہو گئے۔ برطانوی سامراج کا مجرم، وطن کا سپاہی، قرآن کا مبلغ، آزادئ وطن کے جرم میں آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا پرزنر ویگن PRISONER WAGON) کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا۔ ؎

عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا

آخر سینکڑوں انسانوں نے آنسوؤں کے ہار، دل کی دعائیں اور حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ کہہ کر تین سال کے لیے اپنے سے جدا کیا۔

گاڑی نے منزل کی طرف سفر شروع کیا تو شاہ جی نے کھڑکی سے باہر منہ نکال کر کہا ؎

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

باب دوم ــــ ۱۹۲۱ تا ۱۹۳۰ء

فرنگی عہدِ اقتدار کی داستان حقیقت کے اس قدر قریب ہے کہ واقعات کسی بھی زمانے کے مؤرخ کے لیے الجھاؤ پیدا نہیں کرتے۔ آئینہ ہر تصویر کو وقت کے چوکھٹے میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ ماضی کی راہوں سے گزرنے والا ہر مسافر اپنے پاؤں کی ٹھوکر میں نہ جانے کس قدر نشانِ پا لیے ہوئے ہے کہ جس پر زمانے کی بے اعتنائیوں کا گلہ ثبت ہے، زمانہ اپنے قلم سے جن کہانیوں کو رقم کر رہا ہے غروبِ آفتاب کی ہر شام انہیں شفق سے ڈھانپتی چلی جا رہی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہر کہانی کو اپنے عنوان کے لیے کسی عطاء اللہ کے خون کی ضرورت ہوگی لیکن مستقبل کا دامن تہی ہوگا۔

ماضی نے جس عطاء اللہ کو جنم دیا تھا۔ اپنے اور پرائے سامراج نے اسے اس طرح روند ڈالا کہ شاید نصف صدی کے بعد دلوں سے اس کی یاد محو ہو جائے۔ لیکن رات کے بعد دن طلوع ہوتا ہے یا جس طرح خزاں کے بعد بہار جنم لیتی ہے۔ بھولے ہوئے دلوں کو اسی طرح عطاء اللہ کے کارنامے آزادیِ وطن کے لیے ان کی مساعی جمیلہ تبلیغ دین میں ان کے مصائب کو اجاگر کرنا پڑے گا۔ ورنہ زمانے کو اپنی تہی دامنی پر تا حشر گلہ رہے گا۔

لاہور سنٹرل جیل

قومیں اپنے راہنماؤں کی یادگاریں قائم کرتی ہیں زمانہ جن پر گرد و غبار ڈال دیتا ہے۔ وہ انہیں تلاش کرنے میں کھو جاتی ہیں۔ لیکن عہدِ رواں کے تن آسان ہاتھوں نے بنے بنائے نشان مٹا دیے۔ لاہور سنٹرل جیل بھی ایک ایسا ہی نشان تھا اس جیل کی ایک ایک اینٹ پر غلامی کے خلاف لڑنے والوں کے نام ثبت تھے۔ اس جیل

کی ہر کوٹھڑی اسیرانِ فرنگ سے واقف تھی۔ اس جیل کے پھانسی کے تختے شہیدانِ وطن کے خون سے ہر صبح ناشتہ کرتے رہے ہیں۔ ان چشم دید گواہوں کو مٹانے میں وقت کے عاجلانہ فیصلے نے بڑی جانبداری سے کام لیا۔ کاش وہ حالات کا انتظار کرتا۔

شاہ جی کو اس جیل کی گورا وارڈ میں رکھا گیا۔ یہ وارڈ سیاسی قیدیوں کے لیے مخصوص تھی۔ اس دور میں سیاسی قیدیوں کے لیے کوئی امتیازی کلاس متعین نہیں تھی تاہم دو قسم کے قیدیوں کو امتیاز حاصل تھا۔ اول جو انکم ٹیکس گذار تھے۔ دوسرے سٹوڈنٹس۔ لیکن شاہ جی پہلے سیاسی قیدی تھے جنہیں شہرت کی بنا پر یہ کلاس دی گئی۔

معافی کی درخواست

شاہ جی کو لاہور سنٹرل جیل میں آئے ہوئے دو ہفتے ہوئے تھے کہ اچانک ایک دن انہیں جیل کے دفتر میں بلوا کر ان کے سامنے انگریزی میں لکھی ہوئی ایک درخواست پیش کی جس میں درج تھا کہ

"اگر اس دفعہ حکومت مجھے معاف کر دے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ میری کوئی حرکت ایسی نہیں ہو گی جس سے حکومت کو کسی قسم کی شکایت پیدا ہو"

اس درخواست کے نیچے کسی کا نام درج نہیں تھا اور نہ تحقیق پر کسی کا نام مل سکا۔ شاہ جی نے اس درخواست کا ترجمہ سن کر اسے سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ سے لے لیا اور ہزار ٹکڑے کر کے اپنے پاؤں تلے روندا اور تین دفعہ اس پر تھوکا، پھر غصے کی حالت میں واپس چلے گئے۔ اس واقعہ کے تھوڑے دنوں بعد شاہ جی کو میانوالی ڈسٹرکٹ جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس دور میں اور آج بھی میانوالی جیل عادی مجرموں کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور موسم گرما کی تپش کی بنا پر یہ جیل پنجاب کا "کالا پانی" کہلاتی ہے۔ ترکِ موالات اور تحریک خلافت کے قیدیوں کے لیے یہی جیل مناسب سمجھی گئی۔ چنانچہ ہندوستان بھر کے سیاسی رہنماؤں کو آہستہ آہستہ اسی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جن میں یہ نام قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ مولانا محمد داؤد غزنوی۔ ۲۔ مولانا احمد سعید دہلوی۔ ۳۔ مولانا لقاء اللہ پانی پتی۔

۴۔ صوفی محمد اقبال۔ ۵۔ اختر علی خاں (زمیندار لاہور) ۶۔ عبدالمجید سالک (ایڈیٹر روزنامہ انقلاب لاہور) ۷۔ مولانا عبداللہ چوڑی والے (دہلوی)۔ ۸۔ مولانا سید حبیب (ایڈیٹر روزنامہ سیاست لاہور) ۹۔ پنڈت نیکی رام شرما۔۱۰۔ ڈاکٹر ستیہ پال۔ ۱۱۔ لالہ تریلوک چند محروم۔۱۲۔ دیش بندھو داس گپتا (ایڈیٹر روزنامہ تیج دہلی) ۱۳۔ بابا گردت سنگھ۔۱۴۔ سردار منگل سنگھ[۱۵] سردار سردول سنگھ کولیشر (لاہور) ۱۶۔ بابا کھڑک سنگھ (سیالکوٹ) ۱۷۔ سوامی شردھانند (دہلی) ۱۸۔ منشی احمد دین (امرتسر) ۱۹۔ خواجہ عبدالرحیم عاجز (امرتسر) ۲۰۔ راجہ غلام قادر (وزیرآباد)

یہ وہ لوگ ہیں جن میں چند ایسے ہیں جو آگے چل کر صحافت اور ملکی سیاسیات میں غیر ملکی حکمرانوں کے باغی اور متحدہ ہندوستان کے رہنما بنے۔

جیل خانے کے شب و روز باہر کی دنیا سے مختلف ہوتے ہیں۔ گھر بار اور اولاد سے لاتعلق ہو کر قیدی یہاں رہ کر اپنی دنیا آپ آباد کرتا ہے۔ خیالات میں بچپنا اور جذبات میں جوانی لوٹ آتی ہے۔ اونچی دیواروں کے سائے میں رہنے والے سیاسی قیدی بہار و خزاں کے موسم اپنے احول میں آپ ڈھالتے ہیں۔ بلاشبہ میانوالی جیل کا ہر سیاسی قیدی اپنے اندر جوہر قابل کا خزانہ لیے بیٹھا تھا۔ لیکن آزادئ وطن کی پاداش میں برطانوی سامراج کا باغی قرار دیے جانے پر اس کا جسم قید تھا۔ تاہم روح کی افتادگی اسی طرح آزاد تھی۔ اس کی سوچ اور فکر میں کوئی دیوار یا لوہے کا کوئی دروازہ حائل نہیں تھا۔

اسیرانِ افرنگ جنہیں رائج الوقت قانون نے اپنا دشمن قرار دے کر تین تین برس، دو دو برس، اور ایک ایک برس کے لیے یہاں ڈال دیا تھا قفس کی تیلیوں میں بیٹھ کر شاخ گل کی بہاروں کے گیت الاپنے شروع کیے۔ چنانچہ مشاعرے، قوالیاں، جلسے اور علمی بحثوں کا آغاز ہوا۔ اگر ان لوگوں کے وجود سے جیل کے باہر فرنگی حکمران پریشان تھے تو جیل کے اندر حکام جیل اور دوسرے قیدی عاجز آ چکے تھے۔ آخر میانوالی ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر رام جی داس اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ چوہدری فرید احمد[۱] کو اپنی سخت گیر پالیسی کو تبدیل کرنا پڑا

---

[۱] مولانا ظفر علی خاں کے چچا تھے۔

ورنہ باغیوں کا یہ گروہ اپنے ساتھ دوسرے قیدیوں کو بھی خراب کر دیتا۔

شاہ جی ان ہنگامہ آرائیوں کے باوجود جیل میں بھی اپنے تبلیغی مشن سے غافل نہیں رہے۔ راجہ غلام قادر، اختر علی خاں، منشی احمد دین، خواجہ عبدالرحیم عاجز نے قرآن کریم انہی دنوں شاہ جی سے پڑھا۔

آزاد ہائی سکول کا خاتمہ

شاہ جی کی گرفتاری نے ایک طرف گجرات کی سیاسی زندگی کا رخ تبدیل کیا تو دوسری طرف آزاد ہائی سکول کی عمارت بھی اپنا تمام وقار ضائع کر بیٹھی۔ حکومت نے فوراً سکول کا نام اسلامیہ ہائی سکول رکھ کر اسے پنجاب یونیورسٹی کے تحت کر دیا۔ یہ سکول آج بھی اسی نام سے چل رہا ہے لیکن اب اس کا جامعہ ملیہ یا شاہ جی سے کوئی تعلق نہیں۔

تحریک ترکِ موالات کا خاتمہ

ترکِ موالات اور خلافت کی مشترک تحریکات نے ہندوستان بھر کو پرامید کر دیا تھا کہ اب غیر ملکی حکمران یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ ہندوستان سے باہر بھی یہی چرچا تھا۔ حالات کی بو سونگھنے والے سیاست دان اور خود انگریز بھی اپنے قدموں کے نشان گن رہے تھے۔ پرنس آف ویلز نے اپنا دورہ ہندوستان ملتوی کر دیا تھا کہ صوبہ یو پی کے ضلع گورکھپور کے دیہاتی عوام نے اپنے گاؤں "چورا چوری" کے پولیس تھانہ پر حملہ کر کے اسے آگ لگا دی۔ جس میں پولیس کے سپاہی اور افسر جل کر راکھ ہو گئے۔ اس واقعہ نے گاندھی جی کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے ۵ فروری ۱۹۲۲ کو تحریکِ ترک موالات بلا کسی مشورہ کے بند کر دی۔ تحریک کا بند ہونا تھا کہ سارا ہندوستان گاندھی جی کے خلاف ہو گیا۔

۵ نومبر ۱۹۲۱ء کو جو آگ لگی تھی۔ ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو جب یہ بجھائی گئی تو مغربی طاقتیں اپنی کامیابی پر مسکرائیں۔ ان کے بجھتے ہوئے چراغوں میں پھر سے روشنی آگئی۔ وقت نے بخت کو مبارکباد دی۔ یونین جیک کی اڑانیں نیشنل فلیگ پر غالب آگئیں۔

جیل خانوں میں سیاسی قیدیوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مقصد کی ناکامی نے شاخِ ثمر کی بہاروں کو آگ لگا دی۔ قفس کی تیلیاں پاؤں کی بوجھل بیڑیاں بن گئیں۔ لیکن عزم نے ہمت نہ ہاری۔ ناکامیوں نے ارادوں کے آنسو پونچھے تو آنکھیں چمک اٹھیں۔ دل اور زبان نے ہم آہنگ ہو کر کہا "ہم پھر لڑنے کا عہد کرتے ہیں"۔ اسی طرح ایک سال چار ماہ کی جدوجہد آزادی ایک موڑ پر آ کر رک گئی۔

تحریکِ خلافت کا حشر

قوموں کی زندگی کا انحصار ہمیشہ ان کی اپنی ہمت پر رہا ہے۔ جو قومیں اس دور میں بچھڑ جاتی ہیں زمانہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ "ترک" اقوامِ یورپ سے اگر اپنی زندگی کی بھیک مانگتے تو شاید اس مردِ بیمار کو بھیک سے بھی محروم رکھا جاتا لیکن تلوار کی نوک سے حاصل کیا ہوا "ترکی" آج بھی زندہ ہے، اور زندہ رہے گا۔

پہلی جنگ جیت کر اتحادی قوموں نے اپنی نوآبادیات سے جو سلوک کیا اور پھر ترکیہ کو مردِ بیمار سمجھ کر قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفۃ المسلمین کے حرم کو رسوا کیا۔ اگر اس وقت مصطفےٰ کمال کی تلوار بے نیام ہو کر درّہ دانیال پر سامنے نہ آتی تو شاید یورپ کا یہ مردِ بیمار مدت سے دم توڑ چکا ہوتا۔ غازی عصمت انونو نے برطانوی وزیرِ اعظم لائیڈ جارج کو ٹھیک کہا تھا کہ "جو فیصلے تلوار کی نوک سے نہیں لکھے جاتے ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی"۔

ترک اپنی تاریخِ آزادی خون سے مرتب کر رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خون نے جوش مارا۔ مسلمان مسلمان کی امداد کے لیے نکل آیا۔ ہندوستان کا مسلمان غلامی کی حالت میں جو کر سکتا تھا اس نے کیا۔ آخر ۲۱۔ نومبر ۱۹۲۲ء کو جزیرہ لوزان میں برطانیہ اور ترکیہ کے درمیان صلح ہوئی جس میں برطانیہ نے ترکوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ اس کے ساتھ ہی تحریکِ خلافت نے ہندوستان میں دم توڑ دیا۔

تحریکِ شُدھی

افراد، قومیں اور سلطنتیں ایک دوسرے کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ انتقام کی آگ پہلے دلوں میں سلگتی ہے، پھر انسانوں کو جلاتی اور عمارتوں کو خاک کا ڈھیر بناتی ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تحریکات دم توڑ چکی تھیں۔ افغانستان سے انگریز مطمئن ہو چکا تھا، روس کی اندرونی خلفشار بھی انگریز سیاستدانوں کے لیے مفید تھی۔ ترکوں سے معاہدہ لوزان کے بعد کوئی مزید جھگڑا نہیں تھا۔ ہندوستان کے رہنماؤں میں انگریز سامراج کا مخالف عنصر ہنوز جیل خانوں میں تھا۔

انگریز دانشوروں کا ذہن وقتی طور پر فارغ ہوا اور انہیں ہندوستان سے انتقام کی سوجھی۔ ماضی قریب میں جس ہندوستان نے ایوان برطانیہ میں آگ لگا دی تھی، غلامی سے نجات کے لیے جن قوموں نے متحد ہو کر آزادی کی لڑائی لڑی تھی دشمن اب ان دوستوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء کے وسط میں میانوالی جیل سے سوامی شردھانند کو ان کی میعادِ اسیری سے پیشتر رہا کر کے دہلی وائسرائے لاج میں لایا گیا۔ سوامی شردھانند کا اصل نام منشی رام تھا۔ ایک مدت یہ پنجاب پولیس میں بطور تھانیدار ملازم رہ چکے تھے۔ دوسری طرف پنڈت مدن موہن مالوی کو یہ خوف تھا کہ سرحد کا پٹھان ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ اس نے سوامی شردھانند سے مل کر ایک ایسی فرقہ وارانہ تحریک کو ہوا دی جس نے آگے چل کر خوفناک صورتِ حال پیدا کر دی۔

پہلا ہندو مسلم فساد

یوں تو سارے ہندوستان کی فضا مکدر ہو چکی تھی۔ نگاہوں میں میل اور دلوں میں کدورت بیٹھ گئی۔ لیکن ستمبر ۱۹۲۲ء کو ملتان میں محرم کے موقعے پر ہندو مسلم فساد نے سارے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ فساد جس مقام پر ہوا اس کے ایک طرف مسجد، دوسری طرف مندر اور درمیان پولیس تھانہ ہے۔ تعزیہ حرم گیٹ سے شہر میں داخل ہو کر چوک بازار مسجد کے سامنے رکھا گیا۔ اچانک اس پر ایک اینٹ لگی۔ چونکہ تحریک شدھی کے باعث شہر کی فضا پیشتر ہی مسموم تھی، لہٰذا بغیر تحقیق کے کہ اینٹ مندر سے آئی ہے یا تھانہ کی طرف سے ماتم گوساروں نے تعزیہ کی بے حرمتی کے سلسلہ میں ہنگامہ کر دیا۔ تیاری دوسری طرف سے بھی مکمل تھی۔ مقامی ڈپٹی کمشنر مسٹر ایمرسن[1] خود تھانہ میں موجود تھا۔ یہ اینٹ خود اس نے

---

[1] یہی مسٹر ایمرسن ۱۹۲۵ء میں پنجاب کا گورنر ہوا اور مسجد شہید گنج گرانے میں اس کا پورا ہاتھ تھا۔

پھینکی تھی (غیر سرکاری تحقیقات میں اس کی تصدیق ہو گئی تھی)

غلامی میں صرف آزادی ہی سلب نہیں ہوتی بلکہ عقل انسانی بھی اپنی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور مذہب کی پاکیزگی غلامی کے گناہوں سے آلودہ ہو کر اپنا دامن داغدار کر لیتی ہے۔ غلام ہندوستان اپنا وقار تو کھو چکا تھا، لیکن فرقہ وارانہ فضا میں کھو کر عقل و دانش سے بھی دور چلا گیا۔ آخر حکمران قوم کا جادو سر پر چڑھ کر رہا۔ نسیم سحر گاہی کا ہر جھونکا بادسموم بن گیا۔ چمن کا ایک ایک پتا صیاد کا معاون بن کر لالہ و گل کی پتیاں بکھیرنے لگا۔

سوامی شردھانند جو کبھی دہلی جامع مسجد کے منبر پر ہندو مسلمان کو اتحاد کی دعوت دیتے تھے، آج غلامی کی رسیاں مضبوط کر رہے تھے۔

جیل سے رہائی

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

باغبان جب پودوں کی تخم ریزی اور پھر آبیاری کرتا ہے، تو ان کے جوان ہونے تک لیل و نہار کی محنت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ روز و شب کی ستم ظریفیوں سے انہیں محفوظ رکھے۔ موسم کے نشیب و فراز بھی پھول آنے تک سدراہ ہوتے ہیں۔ باغبان کی تمنائیں موسم سے بھی دست و گریبان ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۱۹۲۰ء میں ہندوستانی رہنماؤں نے جس بہار کی آرزو کے لیے لالہ و گل کو اپنا خون دیا تھا، نرگس کی رنگت سورج مکھی کو بانٹ دی تھی اور خزاں سے بہار چھین کر گل و گل چیں کے رشتے کی نیو اٹھائی تھی۔ جب قفس کی تیلیاں ٹوٹیں تو بہاران سے روٹھ چکی تھی۔ شبنم کے آنسو ہچکیاں لے رہے تھے۔ پھر باد نسیم نے موت کی مضراب سے آنے والوں کا استقبال کیا۔ اس بھیانک منظر نے غلامی کی عمر بڑھا دی۔ وقت نے غیر ملکی حکمرانوں کا ساتھ دیا اور حالات اس قدر ناگفتہ بہ

ہوئے کہ آس ٹوٹ گئی اور مقدر روٹھ گیا۔ ایسے حالات میں شاہ جی کٹوتی کے پانچ ماہ لے کر دو سال سات ماہ اسیر فرنگ رہ کر ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو میانوالی جیل سے رہا ہوئے۔ پنجابی کے مشہور شاعر محترم خواجہ عبدالرحیم عاجز بھی شاہ جی کے ساتھ میانوالی جیل سے رہا ہوئے۔ ان کی پنجابی نظم کا ایک مصرعہ اسی زمانے کی یاد ہے ؎

واہ عاجز قسمت دیاں ولیا ۔ پکی کھیر تے ہو گیا دلیا
پھڑ دیاں پھڑ دیاں چڑیاں نوں ۔ توں ہتھوں باز گوا لیا

رہائی کے بعد شاہ جی امرتسر محلہ کوچہ عارف ڈار چوک فرید میں رہائش پذیر ہوئے۔ مالک مکان بابا رحیم خاں کو شاہ جی سے دلی عقیدت تھی۔ جتنی دیر شاہ جی اس مکان میں رہے مالک مکان خادموں کی طرح سلوک کرتا رہا۔

۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۴ء کے حالات میں نمایاں فرق آچکا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب شاہ جی جیل گئے تو ہندوستان کے عوام انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ کو ہوا دے رہے تھے اور جب واپس آئے تو وہی عوام آپس کی آگ میں جل رہے تھے۔ ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج کے اشتراک نے شدھی دسنگھٹن کی تحریک کو ایسی ہوا دی کہ سارے نقشے ہی مٹ گئے۔

شدھی کا عملی پہلو

ضلع آگرہ کے ملکانہ نامی گاؤں کے راجپوت مذہباً مسلمان تھے لیکن رسم و رواج اور شکل و صورت میں ہندو نظر آتے تھے۔ ایسے مسلمان کو ہندو بنا لینا کوئی دشوار نہیں تھا۔ چنانچہ شدھی کے بانیوں نے اس گاؤں کو اپنا مرکز بنا لیا۔ مسلمان رہنما ان دنوں عجیب الجھاؤ میں تھے۔ وہ اپنی شہرت جو انہیں غیر مسلموں میں حاصل تھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف شدھی کی تحریک کو انگریز کی سازش سمجھ رہے تھے۔ ان دوگونہ مشکلات میں پھنسے ہوئے مسلمان رہنماؤں کے دو حصے ہو گئے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کی پارٹی گوشہ تنہائی میں چلی گئی۔ پنجاب میں شاہ جی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، میر غلام بھیک نیرنگ اور مولانا ظفر علیخاں

الگ الگ شدھی کا مقابلہ کرتے رہے ۔ موضع ملکانہ کے راجپوت بھی ان دنوں عجیب الجھن میں تھے ۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا آپس کا کردار انہیں مطمئن نہ کر سکا لیکن ہندوؤں کی دولت تقریباً بیس راجپوتوں کو ہندو بنانے میں کامیاب ہوگئی ۔

۹۔ اور ۱۰۔ستمبر ۱۹۲۴ء کی درمیانی رات کو کوہاٹ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا یہ ملتان اور دوسرے شہروں میں فساد کی صدا سے بازگشت تھی ، جس نے سیاسی رہنماؤں کو پریشان کر دیا ؟ ۔ مہاتما گاندھی نے جو ان دنوں دہلی میں مولانا محمد علی جوہر کے ہاں مہمان تھے ، اکیس دن کے مرن برت کا اعلان کر دیا ۔اس کے ساتھ ہی مولانا محمد علی جوہر کے مشورے سے ۲۶۔ستمبر ۱۹۲۴ء کو اتحاد کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ۔

بگڑے ہوئے تیور اور بدلی ہوئی نگاہوں نے دل و دماغ کے درمیان کانٹے ہی کانٹے بچھا دیئے تھے جس سے اتحاد کا دامن الجھتا ہی چلا گیا ۔ گاندھی جی نے ۱۸۔ستمبر کو اپنا برت شروع کیا ۔ یہ برت ہندوؤں کے طرز عمل کے خلاف بطورِ احتجاج تھا ۔

۲۶۔ستمبر کو مجوزہ اتحاد کانفرنس میں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ شاہ جی بھی شریک ہوئے ۔ دو دن کی بحث کے باوجود تمام رہنما بغیر کسی فیصلہ پر پہنچے دہلی سے چلے گئے ، مگر گاندھی جی نے اپنا برت ۱۸۔اکتوبر تک جاری رکھا ۔ شاہ جی ان حالات و واقعات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بغیر کسی مشورے کے ملک کے موجودہ بگاڑ کی ساری ذمہ داری انگریز حکمرانوں کے سر ڈال کر وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر سامنے آکھڑے ہوئے اور اپنی شعلہ بیانی سے سارے ہندوستان کو اس پس منظر سے آگاہ کیا ۔

شردھانند کی اچانک رہائی ، پنڈت مالوی کا پٹھانوں کے خوف سے ہنگامہ ، ملتان کا فساد یہ ایسی چیزیں تھیں کہ عوام انہیں سن کر اپنی حرکتوں پر شرمندہ ہوئے ۔ برطانوی حکومت کو شاہ جی نے ایسا ننگا کیا کہ جب اس سے کوئی جواب بن نہ آیا تو جنوری ۱۹۲۵ء میں شاہ جی کو دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیا ۔ یہ مقدمہ دہلی کی ایک تقریر پر چلایا گیا ۔اس میں مسٹر آصف علی

الگ الگ شدھی کا مقابلہ کرتے رہے۔ موضع ملکانہ کے راجپوت بھی ان دنوں عجیب الجھن میں تھے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا آپس کا کردار انہیں مطمئن نہ کر سکا لیکن ہندوؤں کی دولت تقریباً بیس راجپوتوں کو ہندو بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

۹۔ اور ۱۰۔ ستمبر ۱۹۲۴ء کی درمیانی رات کو کوہاٹ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا یہ ملتان اور دوسرے شہروں میں فساد کی صدائے بازگشت تھی، جس نے سیاسی رہنماؤں کو پریشان کر دیا ہ۔ مہاتما گاندھی نے جو ان دنوں دہلی میں مولانا محمد علی جوہر کے ہاں مہمان تھے، اکیس دن کے مرن برت کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مولانا محمد علی جوہر کے مشورے سے ۲۶۔ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اتحاد کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔

بگڑے ہوئے تیور اور بدلی ہوئی نگاہوں نے دل و دماغ کے درمیان کانٹے ہی کانٹے بچھا دیے تھے جس سے اتحاد کا دامن الجھتا ہی چلا گیا۔ گاندھی جی نے ۱۸۔ ستمبر کو اپنا برت شروع کیا۔ یہ برت ہندوؤں کے طرزِ عمل کے خلاف بطورِ احتجاج تھا۔

۲۶۔ ستمبر کو مجوزہ اتحاد کانفرنس میں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ شاہ جی بھی شریک ہوئے۔ دو دن کی بحث کے باوجود تمام رہنما بغیر کسی فیصلہ پر پہنچے دہلی سے چلے گئے، مگر گاندھی جی نے اپنا برت ۱۰۔ اکتوبر تک جاری رکھا۔ شاہ جی ان حالات و واقعات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بغیر کسی مشورے کے ملک کے موجودہ بگاڑ کی ساری ذمہ داری انگریز حکمرانوں کے سر ڈال کر وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر سامنے آ کھڑے ہوئے اور اپنی شعلہ بیانی سے سارے ہندوستان کو اس پس منظر سے آگاہ کیا۔

شردھانند کی اچانک رہائی، پنڈت مالوی کا پٹھانوں کے خوف سے ہنگامہ، ملتان کا فساد ایسی چیزیں تھیں کہ عوام انہیں سن کر اپنی حرکتوں پر شرمندہ ہوئے۔ برطانوی حکومت کو شاہ جی نے ایسا ننگا کیا کہ جب اس سے کوئی جواب بن نہ آیا تو جنوری ۱۹۲۵ء میں شاہ جی کو دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیا۔ یہ مقدمہ دہلی کی ایک تقریر پر چلایا گیا۔ اس میں مسٹر آصف علی

وکیل تھے۔ دورانِ مقدمہ شاہ جی نے ضمانت دینے سے انکار کردیا اور مقدمہ میں بھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ دو ماہ کی مسلسل کاروائی کے بعد مسٹر عبدالصمد کی عدالت سے شاہ جی کو چھ ماہ قید با مشقت یا پانچ سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔

جرمانہ کی یہ رقم اہلِ محلہ نے ادا کردی اور شاہ جی رہا کردیے گئے۔ رہائی کے بعد گھر آئے تو جرمانے کی ادائیگی پر سخت ناراض ہوئے۔ کئی دن محلہ کے کسی دوست سے علیک سلیک نہیں کی۔ آخر انہوں نے ایک جگہ جمع ہو کر شاہ جی سے معافی مانگی۔ شاہ جی کو گلہ تھا کہ آپ نے حلال کی کمائی فرنگی خزانے میں کیوں دی۔ ان دنوں شاہ جی کٹڑہ مہا سنگھ کوچہ رنگریزاں میں رہتے تھے۔

بہار کے دنوں میں پھولوں سے لگاؤ مشکل نہیں ہوتا لیکن خزاں کے موسم میں کانٹوں سے گزر کر منزل کو حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ شاہ جی جیل سے رہا ہوئے تو ہندوستان گیر شہرت نے ان کے قدم لیے۔ زمین کے ذرات آسمان کے ستاروں کی طرح ان کے پاؤں چومنے لگے۔ محبت میں نگاہوں کے آنسو پھولوں کی طرح نچھاور ہوئے۔ شاہ جی نے یہ گراں قدر دولت اپنے ہاتھوں ضائع کردی۔ وقت کا تقاضا یہی تھا۔ امڈے ہوئے طوفانوں اور تیز رو آندھیوں کے درمیان شاہ جی تمناؤں کا چراغ لے کر نکلے تھے اور جب لوٹ کر آئے تو یہ چراغ ہنوز روشن تھا۔

شدھی و سنگھٹن کی تحریکات نے خلافت اور کانگریس کے تمام رہنماؤں کو وقت کی چادر میں لپیٹ کر گوشۂ عافیت میں چھپا دیا۔ ہندو رہنما مسلمانوں میں اور مسلمان لیڈر ہندوؤں میں اپنی عزت و وقار کا جنازہ دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، حالانکہ سبھی راز ہائے درونِ پردہ ان ہاتھوں کو جھانک رہے تھے جنہوں نے فرقہ وارانہ آگ روشن کی تھی۔ لیکن زبانیں گنگ اور ہاتھ سمٹ کر رہ گئے تھے۔ ایسے میں شاہ جی نے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف بڑے استقلال کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ ۱۹۲۴ء میں جیل سے رہا ہو کر ۱۹۲۵ء کے وسط تک تحریک شدھی و سنگھٹن کے خلاف شاہ جی نے جس جوشِ ایمانی سے اسلام اور مسلمانوں کی وکالت کی، یہ وقت کا عظیم

کارنامہ ہے۔

حالانکہ شدھی کوئی تحریک نہیں تھی لیکن غیر ملکی حکمرانوں کی ضرورت نے اسے ایسے سانچوں میں ڈھال دیا تھا کہ اگر یہ سانچے اس وقت توڑ نہ دیے جاتے تو ممکن ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے راستے میں کفر حائل ہو جاتا۔ ہندو مسلمان رہنما جو حال ہی میں جیلوں سے رہا ہو کر آئے۔ اس قسم کی تحریک سے وابستگی پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر انصاری، پنڈت موتی لال نہرو ایسے لوگ دہلی میں بیٹھ کر ہندو مہاسبھا کی حرکات کے خلاف تجویزیں تو کرتے رہے لیکن بادِ سموم کے تھپیڑے ان کے دامن کو اس قدر اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی دھجیاں بکھیرنے کے لیے صحن چمن میں قدم رکھتے۔ لیکن شاہ جی نے اپنی شہرت کو شدھی کے مقابل تبلیغ اسلام کر کے ہندوؤں میں ضائع کر لیا۔ پنجاب کے مسلم اخبارات میں صرف "زمیندار" نے اس تحریک میں شاہ جی کی پوری معاونت کی۔

فرقہ وارانہ تحریکات نے ہندوستان کی متحدہ قومیّت کا تصوّر نہ صرف دلوں سے بلکہ ذہنوں سے بھی زائل کر دیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی چلتی ہوئی گاڑی ایسی جگہ آ کر رکی کہ غیر ملکی حکمرانوں کو گھی کے چراغ جلانے کا موقع ملا۔ اس کی تمام تر ذمہ داری ہندو قوم پر ڈالنا انصاف سے بغاوت کے مترادف ہوگا اور جن غیر مسلم رہنماؤں نے انگریز کو خوش کرنے اور غلامی کی عمر بڑھانے کی سعی کی انہیں ہندو قوم سے الگ کرنا بھی اپنے کو فریب دینا ہے۔ تاہم سوامی شردھانند، پنڈت مدن موہن مالوی اور پنجاب کے مہارشی لالہ لاجپت رائے نے ۱۹۲۴ء میں شدھی و سنگھٹن کی پرورش کر کے متحدہ قومیّت سے غداری کی۔ اگر ایسی زہریلی تحریکات کے مقابل میں شاہ جی کی پرجوش تقریریں اور مولانا ظفر علیخاں کی ہنگامی تحریریں نہ ہوتیں تو من حیث القوم مسلمان سخت خسارے میں رہتے۔

تحریکِ قبہ

۱۹۲۵ء سے ایک [illegible] ہے کہ ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی رہنما انگریز اور ہندو کے پیدا کردہ طور و اطوار میں اُلجھے ہوئے تھے، برطانوی حکومت

ـ نے ایک نیا کھیل شروع کیا۔

ہندوستان کے تمام مسلمان والئی حجاز سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، جنہوں نے مکہ اور مدینہ میں بزرگانِ دین کے مزارات سے عمارات (قبے) گرا کر انہیں زمین سے ہموار کر دیا تھا۔

شریفِ مکہ کے زوال کے بعد جب نجدیوں نے اس پاک سرزمین پر قدم جمائے تو ترکوں کی دی ہوئی مذہبی آزادی کے پیشِ نظر عوام نے بزرگوں کے مزارات کو دینی اور دنیوی ضرورتوں کا حاجت روا جان کر انہیں سجدوں کی آماجگاہ بنا لیا تھا لیکن نئے حکمران سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے اپنے عقیدہ کی بنا پر ان تمام حرکات کو خلافِ دین اور بدعت سمجھ کر مزارات سے قبے گرانے کا حکم دے دیا۔ اس کی صدائے بازگشت جب ہندوستان کے ساحل سے ٹکرائی تو مسلمان آپے سے باہر ہو گیا۔

ہوا سازگار نہ ہو تو موسم کا چلن بھی درست نہیں رہتا۔ بادل اٹھتے ہیں تو پھاگن کے دنوں میں بھی ساون بھادوں کا سا گمان ہوتا ہے۔ رہنمایانِ ملک و ملت تین تین برس کی سزا کاٹ کر ابھی جیل خانوں سے رہا ہوئے ہی تھے کہ برطانوی سامراج نے ان کے لیے ایسی فضا پیدا کر دی کہ وہ دل و دماغ کے تصادم میں الجھ گئے۔ شدھی و سنگھٹن کے ہنگامے ہنوز جاری تھے کہ برطانوی سیاستدانوں نے مکہ اور مدینہ کی حرمت کا واسطہ دے کر مسلمانوں کو سلطان ابن سعود کے خلاف بغاوت پر ابھارا اور ہندو سرمایہ دار نے مسلمانوں کا رُخ بدلا ہوا دیکھ کر فائدہ اٹھایا لیکن دیوبند مدرسۂ فکر کے علماء نے آگے بڑھ کر سلطان عبدالعزیز کی حمایت کی۔ چنانچہ شاہ جی نے ان دنوں اپنا مؤقف واضح کرتے ہوئے کہا۔

"میں حنفی العقیدہ مسلمان ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ نفع و نقصان کی وارث صرف اللہ کی ذات ہے۔ حالات کا تغیر بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ اولاد دینا، نہ دینا، دے کر چھین لینا اسی کو زیبا ہے۔

اگر مکہ اور مدینہ کے مقدس مزارات پر جا کر مسلمان سجدہ کرتا تھا۔ ان مزارات سے
مرادیں مانگتا تھا یا انہیں حاجت روا خیال کرتا تھا تو میری رائے ہے کہ سلطان
عبدالعزیز نے ان قبوں کو گرا کر ان میں آخری نیند سونے والوں کی روح کو آرام
پہنچایا ہے۔ یہی وہ نیک لوگ تھے جنہوں نے لات و ہبل اور عزیٰ کی پوجا سے
بنی نوع انسان کو منع کر کے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر تکیہ کرنے کا درس دیا
تھا۔ اگر آج انہی کے مزارات کی پرستش ہونے لگ جائے تو میں سمجھتا ہوں
کہ یہ ان کے مشن سے یا مقصد سے انحراف کر کے توحید باری تعالیٰ سے
بغاوت کرنا ہے۔

شاہ جی نے اس طرزِ استدلال پر سارے ہندوستان میں تقریریں کیں۔ قرآن کریم،
حدیث نبویؐ اور اپنی قوت بیان سے کروڑوں انسانوں کو اسی عقیدے کا درس دیا۔

پنجاب کے پیرانِ عزام نے بدیں وجہ شاہ جی پر "وہابی" ہونے کے علاوہ دوسرے مختلف
اقسام کے فتوے لگائے۔ حضرت پیر جماعت علی شاہ کا فتویٰ اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔
مولانا سید حبیب اور ان کا اخبار روزنامہ "سیاست" پیروں کے مؤید تھے۔ دوسری طرف
مولانا ظفر علی خاں اور "زمیندار" شاہ جی کے ہمنوا تھے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی
جمعیت العلمائے ہند، چودھری افضل حق، مولانا عبداللہ قصوری، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی
نے بھی سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی حمایت میں شاہ جی کا ساتھ دیا۔

ایک سوال

اسی تحریک کے دوران لاہور میں ایک اجتماع ہوا۔ جس میں ایک سوال
کیا گیا:۔

"آپ کے نزدیک اگر قبر پر قبہ بنانا بدعت ہے تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے مزار مبارک پر گنبدِ خضرا سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ مخالفین نے تالیوں سے اس سوال کا استقبال کیا۔ لیکن شاہ جی کو قدرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا۔ سوال پر ذرا مسکرائے اور ارتجالاً فرمایا۔

"اگر ان معماروں نے جرأت کرلی ہے، جنھوں نے نبی کریمؐ کی آخری آرام گاہ سے بھی اونچے ہوکر اس پر قبہ تعمیر کیا ہے تو پھر میری رائے ہے کہ گنبدِ خضرا کے مقابلے میں کوئی گنبد تعمیر نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہوتی ہے۔"

شاہ جی کا یہ جواب سن کر مجمع نعروں سے گونج اٹھا۔

علی برادران کا روحانی تعلق مولانا عبدالباری فرنگی محل (لکھنؤ) سے تھا اور وہ تحریک قبہ میں سلطان ابن سعود سے اختلاف رکھتے تھے حالانکہ ان کی جماعت "خادم حرمین" سے عوام کو توقع تھی کہ وہ تحریک قبہ کی حمایت کریں گے لیکن ان کے ساتھ ہی علی برادران بھی اس تحریک سے تعاون نہ کرسکے تاہم شاہ جی سے متعلق انہوں نے اپنے اخبار "ہمدرد" میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا۔

"بھائی! میں تمہاری تقریر سے بہت خوش ہوا، مگر اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جو رنج ہوا اس کا بھی ذکر کردوں۔ تم نے سامعین کو بالکل مسحور کردیا تھا اور اگر اس کے بعد تم ان سے کوئی غلط کام بھی کرانا چاہتے تو وہ تمہاری تقریر کے کیف سے اس قدر بے خود تھے کہ فوراً کر بیٹھتے۔ جو قدرت تم کو اپنی زبان پر ہے وہ خداداد ہے اور خدا کی ایک بڑی نعمت ہے مگر ایک بڑی خطرناک نعمت ہے۔

تمہاری مقبولیت بہت بڑھ گئی ہے، جب تک تم اسے حق کی راہ میں استعمال کروگے فلاح دارین حاصل کروگے لیکن اگر کبھی یہ باطل کی راہ میں استعمال کی گئی تو ہزاروں بندگانِ خدا کو گمراہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

میرا منصب نصیحت کرنے کا نہیں مگر تم سے جو محبت مجھے اور مجھ سے تم کو ہے اس کی بنا پر اس قدر کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ لوگوں کو مسحور کرنا اچھا نہیں سحرکاری میں نہ ساحر کاروں کے لیے نہ مسحوروں کے لیے فلاح ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہر مسئلے کے دونوں پہلو سامعین کے سامنے پیش کردو اور ان ہی سے اس مسئلہ کا حل اور فیصلہ کراؤ۔ اس طرح تم عوام کی قوتِ فیصلہ کو ترقی دے سکو گے ورنہ "کالانعام" مشہور ہیں۔ آج تم نے انہیں مسحور کر دیا تو کل اسی چرب زبانی اور ظرافت کے باعث ان پر کسی دوسرے کا جادو بھی چل سکے گا اور اس طرح حق و باطل کی تمیز تا قیامت نہ آئے گی۔ کبھی تمہارے ساتھ ہو گی اور کبھی تمہارے مخالفین کے۔ آج تمہیں تخت پر بٹھائیں گے کل تمہیں اتار کر کسی دوسرے کو سریر آرا بنا دیں گے۔"

شدھی اور سنگھٹن کے دوران اگرچہ قبوں کی تحریک بڑی خطرناک تھی، اس تحریک نے مسلمانوں کو آپس میں اُلجھا دیا تھا لیکن چند ماہ کی ہمت اور اتحادِ ذہنی نے برطانیہ اور اس کی ایجنٹ طاقتوں کو شکست دے دی۔

مرزائیت کے خلاف فتویٰ

غیر ملکی دورِ اقتدار کو اپنی زندگی کے لیے جن افراد یا جماعتوں کا سہارا لینا پڑا ان میں آریہ سماج اور قادیانی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ۲۲-۱۹ء سے ۱۹۲۵ء کے دوران ہندو مسلم کشیدگی نے متحدہ قومیت کا جو جلیہ لگاڑا۔ یورپین سیاست گروں نے اس بساط پر کس کس طرح اور کون کون سے مہرے آگے بڑھائے گذشتہ اوراق ان واقعات کی گواہی دے رہے ہیں لیکن ہنوز اس مقدمے کا ایک اہم گواہ باقی ہے جس کے بغیر یہ روداد نامکمل رہے گی اور شاہ جی کی جدوجہد میں ان کے اس کردار کی تعمیر بھی ادھوری سمجھی جائے گی۔

آریہ سماج جب شدھی کی تحریک میں سرگرم تھے اور مسلمان ان کا دفاع کر رہے

تھے انہی دنوں مرزائیوں نے بعض ایسی کتب شائع کیں جن میں آریہ سماج کے بانی سوامی دیا نند کی زندگی پر رکیک حملے کیے جس کے جواب میں آریہ سماج نے قادیانیوں کی بجائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو ہدفِ تنقید بنایا - آریہ سماج اور قادیانیوں کی ان مقابلے کی عبارتوں نے طرفین میں جلتی پر تیل چھڑکا اور حالات بد سے بدتر ہو گئے۔

آخر ہندوستان کے علما نے حکومت سے آریہ سماج کی کتب کی ضبطی کا مطالبہ کیا تو ساتھ ہی مرزائیوں کی کتب کا از سرِ نو مطالعہ کر کے حسب ذیل فتویٰ دیا۔

"مرزا غلام احمد قادیانی نے علی الاعلان دعویٰ نبوت کیا اور دیگر انبیا کرام کی توہین کی ہے - نیز بعض کو گالیاں دیں اور بعض ایسے دعوے کیے کہ جن کی بنا پر وہ خود کافر ہو کر مرا اور اسی طرح اس کے ماننے والے بھی کافر اور مرتد ہیں - لٰہذا ان (مرزائیوں) سے ہر قسم کا قطع تعلق کیا جائے، خواہ وہ دنیوی ہو یا دینی "

امرتسر — رسالہ "الفیض" ایڈیٹر مولانا محمد داؤد
۱۹۲۵ء — پسر مولانا نور احمد

اس پر شاہ جی کے علاوہ اڑھائی سو سے زائد علماء نے دستخط کیے، جن میں علمائے فرنگی محل، علمائے دیوبند، علمائے بریلوی قابل ذکر ہیں - ۱۹۲۰ء کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ شاہ جی نے مرزائیت کے خلاف اپنے دلی احساسات کھلم کھلا اجاگر کر کے مرزائیوں کو بھی اپنے دشمنوں کی صف میں شامل کر لیا۔

پنجاب کے پیروں سے ٹکر

پنجاب کے بعض روحانی پیشواؤں کی گزشتہ تاریخ اس قدر میلی ہے کہ اس کے گندے چھینٹے مذہب کی پاک اور صاف چادر کو بھی داغدار کر گئے - بزرگانِ دین کے مزارات پر بیٹھ کر ان صنتوں نے نہ صرف اسلام کی متعین راہوں کے درمیان گڑھے کھود دیے بلکہ دنیوی جاہ و حشمت کے لیے

اپنے درباروں کی رونق بھی کفر سے مستعار لی۔ اپنے طرۂ دستار کی جوانی ترکوں کے خون سے قائم رکھی۔ اس کے پیچ وخم میں عرب کے یتیم اور معصوم بچوں کی آہ و بکا زینت بنی۔ ان کی دعائیں اور تعویذ ہمیشہ کفر کے ساتھ رہے۔

مقاماتِ مقدّسہ کی بربادی، جزیرۃ العرب پر برطانیہ کا بالواسطہ قبضہ اور خلافت اسلامیہ کی تباہی کے بعد ۱۹۱۸ء میں جب انگریز کو فتح ہوئی اور وہ بغداد کی گلیوں اور قسطنطنیہ کے بازاروں میں محو رقص تھا ان دنوں پنجاب کے پیرانِ غلام نے لاہور میں غیر سرکاری دربار کے موقع پر جس میں پنجاب کے گورنر مسٹر ایڈوائر[1] اور لیڈی ایڈوائر کو مہمانِ خصوصی کے طور پر شمولیت کی دعوت دی گئی تھی حسب ذیل سپاسنامہ گورنر اور لیڈی گورنر کو پیش کیا گیا۔

سپاسنامہ بحضور نواب ہز آنر سر مائیکل فرانسس ایڈوائر جی۔سی۔آئی۔ای۔کے۔سی۔آئی۔ایس گورنر بہادر پنجاب۔

حضور والا! ہم خادم المعترار سجادہ نشیناں و علماء مع متعلقین شہر کائے حاضر الوقت مغربی حصہ پنجاب نہایت ادب و عجز و انکسار سے یہ ایڈریس لے کر خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے ہیں اور ہمیں یقین کامل ہے کہ حضور انور جن کی ذاتِ عالی صفات میں قدرت نے دل جوئی، ذرہ نوازی اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے ہم خاکسارانِ باوفا کے اظہارِ دل کو توجہ سے سماعت فرما کر ہمارے کلاہ فخر کو چار چاند لگا دیں گے۔

سب سے پہلے ہم ایک دفعہ پھر حضور والا کو مبارک باد کہتے ہیں کہ جس عالمگیر اور خوفناک جنگ کا آغاز حضور کے عہد حکومت میں ہوا، اس نے حضور ہی کے زمانے میں بخیر و خوبی انجام پایا اور یہ بابرکت و باحشمت سلطنت جس پر پہلے بھی کبھی سورج غروب نہیں ہوا تھا اب آگے سے زیادہ روشن اور اعلیٰ عظمت کے

---

[1] مسٹر ایڈوائر وہی ہیں جن کے حکم سے اپریل ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ میں گولی چلائی گئی تھی۔

ساتھ جنگ سے فارغ ہوئی - جیسا کہ شہنشاہ معظم نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا ہے، واقعی برطانوی تلوار اس وقت نیام میں داخل ہوئی جب دنیا کی آزادی امن وامان اور چھوٹی چھوٹی قوموں کی بہبودی مکمل طور پر حاصل ہو کر بالآخر سچائی کا بول بالا ہو گیا۔

حضور کا زمانہ ایک نہایت نازک زمانہ تھا اور پنجاب کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی عنانِ حکومت اس زمانہ میں حضور جیسے صاحب استقلال، بیدار مغز عالی دماغ حاکم کے مضبوط ہاتھوں میں رہی جس نے نہ صرف، اندرونی امن ہی قائم رکھا، بلکہ حضور کی دانشمندانہ رہنمائی میں پنجاب نے اپنا ایثار، وفاداری اور جانثاری کا وہ ثبوت دیا جس سے شمشیر سلطنت کا قابل فخر وعزت لقب پایا۔ بھرتی کا معراج صلیب احمر کی اعجاز دست گیری، قیام امن کی تدبیر التعلیم کی ترقی سب حضور کی بدولت ہمیں حاصل ہوئیں۔ حضور ہی ہیں کہ جنہوں نے ہر موقع وہر وقت پنجاب کی خدمات وحقوق پر زور دیا۔ صرف جناب والا کو ہی ہماری بہبودی مطلوب نہ تھی بلکہ صلیب احمر نسواں کے نیک کام میں حضور کی ہمدم وہمراز جنابہ لیڈی ایڈوارڈ صاحبہ نے جن کو ہم مروت کی زندہ تصویر سمجھتے ہیں، ہمارا ہاتھ بٹایا اور ہندوستانی مستورات پر احسان کر کے ثواب دارین حاصل کیا۔ ہماری ادب سے التجا ہے کہ ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

حضور انور! جس وقت ہم اپنی آزادیوں کی طرف خیال کرتے ہیں جو ہمیں سلطنت برطانیہ کی طفیل حاصل ہوئی ہیں، جب ہم ان دخانی جہازوں کو سطح سمندر پر اٹھکیلیاں کرتے دیکھتے ہیں، جن کی طفیل ہمیں اس مہیب جنگ میں امن وامان حاصل رہا، جب ہم تار برقی کے کرشموں پر علی گڑھ و اسلامیہ کالج لاہور، پشاور جیسے اسلامی کالجوں اور دیگر قومی درسگاہوں پر نظر ڈالتے ہیں اور پھر جب ہم

بے نظیر برطانوی انصاف کو دیکھتے ہیں، جس کی حکومت میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں تو پھر ہر طرف احسان ہی احسان دکھائی دے رہا ہے

بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

باوجود فوجی قانون کے جو، خود فتنہ پردازوں کی شرارت کا نتیجہ تھا۔ مسلمانوں کے مذہبی احساس کا ہر طرح سے لحاظ رکھا گیا۔ شب برات کے موقع پر انہیں خاص رعائتیں دیں ۔ رمضان مبارک کے واسطے حالانکہ اہل اسلام کی درخواست یہ تھی کہ فوجی قانون ساڑھے گیارہ بجے شب سے دو بجے تک مسدود کیا جائے۔ لیکن حکام سرکار نے یہ وقت بارہ بجے سے دو بجے کر دیا۔ مسجد شاہی جو فی الاصل قلعہ سے متعلق تھی، جو ابتدائی عمل داری سرکار ہی میں واگزار ہوئی تھی، اہالیانِ لاہور نے اس مقدس جگہ کو ناجائز سیاسی امور کے واسطے استعمال کیا۔ جس پر متولیانِ مسجد نے جو خود مفسدہ پردازوں کو روک نہیں سکتے تھے، سرکار سے امداد چاہی۔ یہی وجہ تھی کہ سرکار نے ایسا ناجائز استعمال بند کر دیا۔ ہم تہ دل سے مشکور ہیں کہ حضور والا نے پھر اس کو واگزار کر دیا ہے۔

سرکار نے حج کے متعلق جو مہربانی کی ہے اس سے ہم ناآشنا نہیں اور مشکور ہیں۔ ہم سچ عرض کرتے ہیں کہ جو برکات ہمیں اس سلطنت کی بدولت حاصل ہوئیں اگر ہمیں عمر خضر بھی نصیب ہو تو بھی ہم ان احسانات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کے لیے سلطنت برطانیہ ابر رحمت کی طرح نازل ہوئی اور ہمارے ایک بزرگ نے جس نے پہلے زمانہ کی خانہ جنگیاں اور بدامنیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں اس سلطنت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا [1]

ہوئیں بدنظمیاں سب دور انگریزی عمل آیا
[illegible] عمل آیا

ہم وہ احسان کبھی نہیں بھول سکتے جب ترکوں نے ہمارے مشورے کے خلاف کوتاہ اندیشی سے دشمنوں کی رفاقت اختیار کی تو ہمارے شہنشاہ نے ازراہِ کرم ہم کو یقین دلایا کہ ہمارے مقدس مقامات کی حرمت میں سرِ مُو فرق نہیں آئے گا۔ اس الطافِ خسروانہ نے ہماری وفا میں نئی روح پھونک دی۔ ھَلْ جَزَاءُ الاحسان اِلّا الاحسان (احسان کا بدلہ احسان کے سوا نہیں ہے)

ہم ان احسانوں کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ اب اس جنگ کے خاتمے پر صُلح کانفرنس سلطنتِ ترکیہ کی نسبت جلد فیصلہ ہونے والا ہے۔ ممکن ہے یہ فیصلہ مسلمانوں کی امیدوں کے برخلاف ہو لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اس فیصلہ میں سرکارِ برطانیہ اکیلی مختار کار نہیں ہے بلکہ بہت سی طاقتوں کا بھی اس میں ہاتھ ہے۔ شہنشاہِ معظم کے وزراء جو کوششیں ترکی کے حق میں کرتے رہے ہم اس کے واسطے سے ان کے بہرحال مشکور رہیں۔ یہ امر مُسلّمہ ہے کہ یہ جنگ مذہبی اغراض پر مبنی نہ تھی اور اپنے اپنے عمل کا اور اس کے نتائج کا ہر ایک ذمہ دار ہے ۔

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

مگر ہمیں پوری توقع ہے کہ ہماری گورنمنٹ اس بات کا خیال رکھے گی کہ مقاماتِ مقدسہ کا اندرونی نظم و نسق مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں رہے اور ہم حضور سے درخواست کرتے ہیں کہ جب حضور وطن کو تشریف لے جائیں تو اس نامور تاجدارِ ہندوستان کو یقین دلائیں کہ چاہے کیسا ہی انقلاب کیوں نہ ہو۔ ہماری وفاداری میں سرِ مُو فرق نہ آیا ہے اور نہ آسکتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اور ہمارے پیروان اور مریدان فوجی وغیرہ جن پر سرکارِ برطانیہ کے بے شمار احسانات ہیں ہمیشہ سرکار کے حلقہ بگوش اور جاں نثار رہیں گے۔

ہمیں نہایت رنج وافسوس ہے کہ ناتجربہ کار نوجوان امیر امان اللہ خاں والئی کابل نے کسی غلط مشورے سے عہد ناموں کے اور اپنے باپ دادا کے طرزِ عمل کی خلاف ورزی کر کے خداوند تعالیٰ کے صریح حکم

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا — یعنی وعدے کا ایفا کرو۔ ضرور وعدے کے متعلق پوچھا جائے گا۔

کی نافرمانی کی۔ ہم جناب والا کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم امیر امان اللہ کے اس طرزِ عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ہم اہالیانِ پنجاب احمد شاہ کے حملوں اور نادر شاہی قتل و غارت گری کو نہیں بھول سکتے۔ ہم اس غلط اعلان کی جس میں اس نے سراسر خلاف واقعہ لکھا ہے کہ اس سلطنت کی مذہبی آزادی میں خدانخواستہ رکاوٹ واقع ہوئی تردید کرتے ہیں۔ امیر امان اللہ خاں کا خاندان سرکارِ انگلشیہ کی بدولت بنا اور اس کی احسان فراموشی کفرانِ نعمت سے کم نہیں۔

ہم کو ان کوتاہ اندیش دشمنانِ ملک پر بھی سخت افسوس ہے جن کی سازش سے تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی اور جنہوں نے اپنی حرکاتِ ناشائستہ سے پنجاب کے نیک نام پر دھبہ لگایا۔ مقابلہ آخر مقابلہ ہی ہے اور کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ یہ حضور والا ہی کا زبردست ہاتھ تھا جس نے بے چینی و بدامنی کا اپنے حُسنِ تدبّر سے فی الفور قلع قمع کر دیا۔ ان بدبختوں سے ازراہِ بدبختی فاش غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن حضور ابرِ رحمت ہیں اور ابرِ رحمت زرخیز اور شور زمین دونوں پر یکساں برستا ہے۔ ہم حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان گمراہ لوگوں کی مجنونانہ و جاہلانہ حرکات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے

اور بدامنی مت پیدا کرو اور اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ۰ یعنی بے شک خدا فساد کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

حضورِ انور! اگرچہ آپ کی مفارقت کا ہمیں کمال رنج ہے ؎

سر غم سے جھکے کیوں نہ سردار ہمارا

لو ہم سے چھٹا جاتا ہے سردار ہمارا

لیکن ساتھ ہی ہماری خوش نصیبی ہے کہ حضور کے جانشین سر ایڈورڈ میکلیگن بالقابہم جن کے نام نامی سے پنجاب کا بچہ بچہ واقف ہے، جن کا حسن اخلاق رعایا نوازی میں شہرہ آفاق ہے۔ جو ہمارے لیے حضور کے پورے نعم البدل ہیں۔ ہم ان کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کی خدمت میں یقین دلاتے ہیں کہ ہم مثل سابق اپنی عقیدت و وفاداری کا ثبوت دیتے رہیں گے۔

حضور اب وطن کو تشریف لے جانے والے ہیں۔ ہم دعا گویاں جناب باری میں دعا کرتے ہیں کہ حضور مع لیڈی صاحبہ و جمیع متعلقین مع الخیر اپنے پیارے وطن پہنچیں، تا دیر سلامت رہیں اور وہاں جا کر ہم کو دل سے نہ اتار دیں۔ ع این دعا از ما و از جملہ جہاں آمین باد

المستدعیان

مخدوم حسن بخش قریشی، مخدوم غلام قاسم سجادہ نشین خانقاہ، مخدوم شیخ محمد، نواب حسن، مخدوم سید حسن علی، سید ریاض الدین شاہ، پیر غلام عباس شاہ، دیوان سید محمد پاکپٹن، خان بہادر مخدوم حسن بخش آف ملتان، مخدوم صدر الدین شاہ آف ملتان، میاں نور احمد سجادہ نشین، پیر محمد رشید، شیخ شہاب الدین، خان بہادر شیخ احمد، سید محمد حسین شاہ شیر گڑھ ضلع منٹگمری، مخدوم شیخ محمد راجو آف ملتان، دیوان محمد غوث، محمد مہر علی شاہ جلالپور، پیر محمد خضر حیات شاہ، صاحبزادہ محمد سعد اللہ آف سیال شریف، سید غلام محی الدین خلف الرشید سید مہر علی شاہ آف گولڑہ شریف، سید قطب علی

شاہ آف ملتان، پیر چراغ علی آف ملتان، پیر ناصرالدین شاہ آف شاہ پور، پیر غلام احمد شاہ آف شاہ پور، مخدوم غلام قاسم سجادہ نشین، سید نوازش حسین شاہ آف شیر گڑھ ضلع منٹگمری، مولوی غلام محمد خادم گوڑہ شریف، سید فدا حسین ضلع کیمبل پور، محمد اکبر شاہ آف شیر شاہ ملتان، غلام قاسم شاہ آف شیر شاہ ملتان، مولوی سید زین العابدین شاہ آف ملتان، پیر چراغ شاہ کوٹ سدھانہ جھنگ محبوب عالم خادم گوڑہ شریف، منشی حیات محمد گوڑہ شریف، برہان الدین خادم گوڑہ شریف۔

۱۹۲۶ء میں جب پنجاب خلافت کمیٹی نے ڈاکٹر محمد عالم کو اپنے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے لیے ملتان کے حلقے سے نامزد کیا تو اس سلسلہ میں شاہ جی کو پہلی دفعہ ملتان جانے کا موقع ملا۔ اہالیانِ شہر نے مندرجہ بالا سپاسنامہ شاہ جی کو دکھایا، جسے پڑھ کر شاہ جی کو بے حد صدمہ ہوا۔ دنیا کی روحانی اصلاح کرنے والے کافر حکومت کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ چنانچہ بانگ لنگے [illegible] مسلسل تین دن اسی سپاسنامے کے ساتھ ساتھ پیرانِ عظام سے کہا:

”اے پیران طریقت! یہ سپاسنامہ فرنگی کے حضور پیش کر کے آپ نے اپنے آباؤ اجداد کی تعلیم، ان کے اصول، ان کی روحانی زندگی پر وہ کالک مل دی ہے کہ قیامت تک یہ داغ نہیں دھویا جا سکتا اور نہ یہ سیاہی مٹ سکتی ہے۔

اگر میں ابن سعود کی حمایت کروں تو کافر اور تم ترکوں کے قتل پر دستخط کرو تو مومن، تم فتح بغداد پر چراغاں کرو تو مسلمان اور میں فرنگی سے آزادی کے لیے لڑوں تو مجرم۔ تمہارے تعویذ، تمہاری دعائیں کافر کی فتح کی آرزومند رہیں اور میں سلطنت برطانیہ کی بنیاد اکھاڑنے کے درپے رہا۔ تم نے انسانوں سے زیادہ کتے اور سوروں کی قدر کی اور گناہ کو ثواب کا درجہ دیا۔ تمہاری قبائیں خونِ مسلم سے داغدار ہیں۔

اے دُم بریدہ سگانِ برطانیہ! صورِ اسرافیل کا انتظار کرو کہ تمہاری فردِ جرم تمہارے سامنے لائی جائے اور تم اپنے نامۂ اعمال کو ندامت کے

آئینے میں دیکھ سکو۔

تمہاری تسبیح کا ایک ایک دانہ تمہارے فریب کا آئینہ دار ہے۔ تمہاری دستار کے پیچ وخم میں ہزاروں پاپ جنم لیتے ہیں اور تم انہیں دیکھتے ہو مگر تمہاری زبانیں گنگ ہیں کہ ان کی موت پر آنسو تک نہیں بہتے۔ وقت کا انتظار کرو کہ شاید تمہاری پیشانیوں کے محراب کی سیاہی تمہارے چہروں کو مسخ کر دے اور تمہارا زہد و تقویٰ ہی تمہاری رسوائی کا باعث بن جائے۔"

پھر شاہ جی نے لنگے خاں کے باغ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس باغ کے گل بوٹے گواہ رہیں کہ میں نے تین دن کی مسلسل تقریروں سے باغبانِ قوم و وطن کے فریب سے بنی نوع انسان کو آگاہ کر دیا ہے۔ باغ کی روشیں میری گفتگو کو اپنے دامن میں محفوظ کر لیں، شاید قیامت کے دن میں اپنی نجات کے لیے ان سے طلب کروں۔

اے بادِ بہاری کے خوشگوار جھونکو! شہادت دینا کہ میں نے اہلِ ملتان کے سامنے حق و باطل کے درمیان دیوار کی نشاندہی کر دی ہے۔

ڈاکٹر محمد عالم ووٹوں کی کافی اکثریت سے پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

ان تقریروں سے شاہ جی نے ملتان میں اپنا ایک حلقہ پیدا کیا اور دوستوں کی خاصی تعداد ان کے گرد جمع ہو گئی۔ لیکن دوسری طرف پنجاب کے پیروں نے لڑائی کی بنیاد اٹھائی۔ حالانکہ اس سیاسنامے کے نیچے شاہ جی کے روحانی پیشوا حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب کے [illegible] برطانوی استعمار سے نفرت کے باعث شاہ جی نے اپنی عقیدت [illegible]

[illegible] اپنے ساتھ دینے والوں سے ہمیشہ بغدر رہا اور خفا بھی۔ پہاڑوں کی بلندیاں اور سمندر کی گہرائیاں اپنے وفاق سے ان لوگوں کی منزل روکتی رہیں، جنہوں نے وقت اور زمانے

سے بے پروائی برتی۔

جلالِ پادشاہی سے تو بیر تھا ہی مگر خلوصِ فقیر بھی بے اعتنار ہا۔ جنونِ شوق میں جب دیوانے بادہ پیمائی کو نکلے تو بادِ سحر گاہی بادِ سموم سے ہم آہنگ ہوئی کہ ریت کے ذرّات دیوانوں کی پیشوائی نہ کر سکے۔ لیکن جن کے سامنے منزل ہوتی ہے وہ آبلہ پائی کے نشانوں پر سفر کرتے ہیں۔ انہیں نہ زمانہ روک سکتا ہے، نہ وقت کا کوئی فیصلہ ان سے متصادم ہوتا ہے۔

شاہ جی جب گھر سے چلے تھے نہ قالین ان کے پاؤں تلے تھے نہ سونے کا چھتّر سر پر تھا۔ درویش جب تاجِ شاہی سے ٹکراتا ہے تو قباؤں کے پیوند ہی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

۱۹۲۶ء کا سال شاہ جی کی زندگی میں مصروف ترین سال تھا۔ انگریز، ہندو، مرزائی اور پنجاب کے پیر اس آزاد منش انسان سے اپنے اپنے انتقام کے لیے وقت سے ہم آہنگ رہے لیکن فطرت اس کا احاطہ کیے ہوئے تھی کہ وہ طوفان اور آندھیوں کے درمیان چراغِ مصطفویؐ کو ہتھیلی پر روشن کیے چلا جا رہا تھا۔

محلہ داروں کا کہنا ہے کہ اندرونِ خانہ شاہ جی کے حالات اس قدر ناگفتہ بہ تھے کہ ذول کے بعد محلہ داروں کو معلوم ہوتا تھا کہ کئی دنوں سے چولہے میں آگ نہیں جلی لیکن کبھی حرم سے آواز نہیں نکلی، نہ دستِ سوال دراز ہوا۔ صبر و استقلال سے گھر کے ماحول نے پیغمبروں کے گھرانوں کی یاد تازہ کر دی۔

تحریک شاتمِ رسولؐ

غلامی کا ہر سال جد و جہد "آزادی" کے لیے مصائب و آلام کے کوہِ گراں لے کر آیا۔ ان دنوں ہر صبح کا طلوع ہونے والا آفتاب اپنی کرنوں میں محبّانِ وطن کے لیے ایسے فیصلے لے کر طلوع ہوتا کہ جن میں دار و رسن کے فیصلے جلی طور پر رقم ہوتے۔

لیکن ۱۹۲۶ء کا سورج عجب انداز سے ابھرا کہ غیر ملکی استعمار اگر ایک طرف آتشیں اسلحہ سے لیس تھا تو دوسری طرف سیاسی بساط کے مہرے اس رُخ پر چلائے کہ ان کی ہر چال شہ کو مات دیتی ہوئی چلی گئی۔

سائمن کمیشن میں ہندوستان کی عدم شمولیت، لارڈ برکن ہیڈ کا چیلنج اور ہندوستانی رہنماؤں کے فیصلے ہنوز متصادم تھے کہ آریہ سماج اور مرزائیوں کی چپقلش نے ہندوستان میں تحریک شاتم رسولؐ کو جنم دیا۔

۱۸۷۵ء میں پنڈت دیانند کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" پہلی بار بنارس میں شائع ہوئی قادیانی مذہب کے بانی مرزا غلام احمد نے "ستیارتھ پرکاش" کے شائع ہوتے ہی کتاب ہذا کے مصنف اور دوسرے رہنماؤں کو چیلنج کیا کہ "جو کتاب میں (مرزا غلام احمد) مستقبل قریب میں لکھنے والا ہوں اگر ہندو اور سوامی دیانند مجھے اس کا جواب دیں تو میں انہیں دس ہزار روپیہ انعام دوں گا"۔ اس کے بعد مرزا غلام احمد کی کتاب "براہین احمدیہ" کا سلسلہ شائع ہونا شروع ہوا جس میں ہندو دھرم، وید، آریہ سماج، پنڈت دیانند پر اعتراضات و الزامات تراشے گئے۔

اکتوبر ۱۸۸۳ء میں پنڈت دیانند کی موت واقع ہوئی اور ۱۸۸۴ء میں "براہین احمدیہ" کی چوتھی جلد شائع ہوئی۔ اس میں پنڈت دیانند کی موت پر اس کے خلاف زورِ قلم کا مظاہرہ دیکھا گیا۔ آخر اسی سال ستیارتھ پرکاش کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اضافی طور پر جن دو ابواب کو شامل اشاعت کیا، ان میں داعئ اسلام حضور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر براہِ راست حملے کیے گئے تھے، جنہیں مسلمان برداشت نہ کر سکا اور کتاب ہذا کے خلاف ہندوستان بھر میں احتجاجی مظاہرے اور جلسے ہوئے نیز حکومت سے اس کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کیا گیا۔

انہی دنوں قاسم علی (مرزائی) کی کتاب "انیسویں صدی کا مہارشی دیانند" شائع ہوئی جس میں پنڈت دیانند کو ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا۔ اس کتاب کے بازار میں آتے ہی ہندو

مسلمان پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکھڑے ہوئے۔ قاسم علی (مرزائی) کے جواب میں آریہ سماجی لیڈر پنڈت چمپاوتی ایم، اے پروفیسر ڈی، اے، وی کالج لاہور نے (نعوذ باللہ) "رنگیلا رسول" ایسی رسوائے عالم کتاب لکھی۔

یہ سارا تماشہ ان دنوں ہوا جب لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند کا چیلنج قبول کرتے ہوئے رہنمایانِ ہند نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ نیز باہم مل بیٹھنے کی تجویزیں پاس کی تھیں۔

ان واقعات کے یہاں پہنچنے تک، ۱۹۲۷ء کا سال اپنے سفر کی ایک تہائی منزل طے کر چکا تھا۔ لیکن آریہ سماجی اور مرزائیوں کی باہم تلخ نوائی نیز ان کی تحریری جنگ نے ہندوستان کے سنبھلتے ہوئے حالات کو ازسر نو پلٹا دیا۔ گو شدھی و سنگھٹن کی باد سموم کے باعث صحن چمن کی ہر روش اپنی نگاہوں کے ڈورے سرخ کیے بیٹھی تھی۔ تاہم احساس ہو رہا تھا کہ شبنم کے آنسو اور بادِ صبح گاہی کے معانقے سے فضاؤں میں انقلاب رونما ہوگا اور صیاد کے ظلم و جور کی بجلیوں سے جلتے ہوئے آشیانوں کو پھر سے تنکے جمع کرنے کا موقع ملے گا۔ مگر بکھرے ہوئے زہر نے دریا کے ہر قطرے کو مسموم کر دیا۔

شاتم رسول واجبِ قتل ہے

اس مسموم فضا میں امرتسر کے ایک ہندی رسالہ "ورت مان" نے بھی خاتم الانبیاء علیہ السلام کی ذاتِ گرامی پر کیچڑ اچھالا جسے رائج الوقت قانون نے چھ ماہ کی سزا دی۔ لیکن کتاب "رنگیلا رسول" (نعوذ باللہ) نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا۔ علمائے دین کی توجہ جب کتاب ہذا کی طرف ہوئی تو جمعیۃ العلمائے ہند نے شاتم رسول کو واجب القتل قرار دیا۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی عبد العزیز نامی شخص نے کتاب ہذا کے ناشر مہاشہ راجپال پر، جس نے کہ مصنف کی ذمہ داری بھی قبول کر لی تھی، لاہور میں قاتلانہ حملہ کیا، جس سے راج پال زخمی ہوا اور حملہ آور کو چودہ سال کی سزا ہوئی۔

اس کے بعد خدا بخش نامی (المعروف اکو تجیا) نے حملہ کیا، مگر یہ وار بھی جان لیوا

بت نہ ہوا۔ خدا بخش کو چھ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ راج پال کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ آخر مسلسل قاتلانہ حملوں اور مسلمانوں کے اضطراب کے ردِ عمل پر حکومت نے ا شہ راج پال کو گرفتار کر لیا۔ عدالت نے تین سال قید اور جرمانے کی سزا دی لیکن سیشن جج نے جرمانہ معاف کر دیا اور سزا بحال رکھی۔ ہائی کورٹ میں اپیل پر جسٹس کنور دلیپ سنگھ (عیسائی) نے راج پال کو بری کر دیا۔ اس فیصلے پر لاہور کے انگریزی روزنامہ "مسلم آؤٹ لک" نے تبصرہ کیا تو اسے توہین عدالت پر سزا ہوئی۔ جسٹس کنور دلیپ سنگھ کے اس رویّہ پر عوام کا احتجاج اس قدر عام ہوا کہ حکومت کو عدالت عالیہ کی پوزیشن محفوظ کرنا مشکل ہو گئی۔

شاہ جی کا موقف

۴ ر اور ۵۔ جولائی ۱۹۲۷ء کی درمیانی رات کو مسلمانان لاہور کی طرف سے دہلی دروازہ کے باغ میں ایک جلسے کا اعلان کیا گیا، جس میں شاہ جی، مولانا احمد سعید، مولانا مفتی کفایت اللہ، چودھری افضل حق، خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے تقریریں کرنی تھیں۔ لیکن اسی روز لاہور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر اوگلوی نے دفعہ ۱۴۴ لگا کر جلسے کو ممنوع قرار دے دیا۔ مگر شاہ جی کی تجویز پر جلسہ میاں عبدالرحیم کے احاطہ میں منعقد کیا گیا۔ (یہ احاطہ موجودہ مزار حضرت شاہ محمد غوثؒ بیرون دہلی دروازہ کے بالمقابل واقع ہے) اس وسیع احاطہ میں ہزاروں لوگ جمع ہو گئے اور جلسے کی صدارت چودھری افضل حق نے کی۔ فوج اور پولیس کے علاوہ مسٹر اوگلوی ذاتی طور پر بھی احاطہ کے باہر موجود تھے اور اندر آ کر اعلان کیا کہ:۔

"دفعہ ۱۴۴ کے باعث یہ مجمع خلافِ قانون ہے۔ آپ لوگ پانچ منٹ کے اندر یہاں سے چلے جائیں ورنہ مجھے گولی چلانے کا حکم دینا پڑے گا۔"

ڈپٹی کمشنر کے اس اعلان پر خواجہ عبدالرحمٰن غازیؔ نے ڈپٹی کمشنر کو انگریزی میں کہا:۔

"ہم اس قانون کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہیں، جو قانون ہمیں ناموسِ پیغمبر کی حفاظت کی ضمانت نہیں دیتا۔ تم جو چاہو کرو ہم یہ جلسہ کریں گے۔"

اس کے بعد شاہ جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"آج ہم سب فخرِ رُسل صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کو برقرار رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ بنی نوع انسان کو عزّت بخشنے والے کی عزّت خطرے میں ہے۔ آج اس جلیل القدر ہستی کا ناموس معرضِ خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزّت پر تمام موجودات کو ناز ہے۔

آج مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کے دروازے پر ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آئیں اور فرمایا کہ ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کفار نے ہمیں گالیاں دی ہیں؟ ——— ارے دیکھو تو! ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دروازے پر تو کھڑی نہیں"؟

یہ سن کر حاضرین میں کہرام مچ گیا اور مسلمان ڈھاریں مار مار کر رونے لگے۔ شاہ جی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"تمہاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو، لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج سبز گنبد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تڑپ رہے ہیں اور خدیجہؓ اور عائشہؓ پریشان ہیں۔ بتاؤ! تمہارے دلوں میں امہات المومنینؓ کی کیا وقعت ہے؟ ——— آج ام المومنین عائشہؓ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہی جنہیں رسول اللہ حمیرا کہہ کر پکارتے تھے۔ جنہوں نے سیّد دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔

اگر تم خدیجہؓ اور عائشہؓ کی ناموس کی خاطر جانیں دے دو تو کچھ کم فخر کی بات نہیں۔ یاد رکھو! یہ موت آئے گی، تو پیامِ حیات لے کر آئے گی"!

(روزنامہ زمیندار، ۔جولائی ۱۹۲۷ء)

یہ تقریر اس قدر مؤثر اور جذباتی تھی کہ تمام مجمع میں حشر بپا تھا۔ شاہ صاحب کی تحریک پر لوگوں کے جتھے باغ میں جلسہ گاہ جاتے اور گرفتار ہو جاتے۔ ان پر لاٹھی چارج بھی کیا جاتا۔ یہ سلسلہ تھوڑی دیر جاری رہا۔ بعدازاں شاہ جی نے عوام کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی اپیل کی اور کہا،

"ہمارا مؤقف قتل و غارت گری نہیں۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ برطانوی حکومت تعزیرات ہند میں ایک ایسی دفعہ کا اضافہ کرے جس کی رو سے بانیانِ مذاہب کے خلاف تقریر و تحریر کی پابندی ہو اور اس کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم قرار پائے۔"

اس قرارداد کے بعد جلسہ برخاست کر دیا گیا لیکن عوام کو پرامن طور پر احاطہ سے باہر نکالنے کے لیے شاہ جی خود دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ ان کے سامنے مسٹر اوگلوی کھڑا تھا۔ شاہ جی اپنے مخصوص انداز میں لوگوں کو پرامن رہنے کی تلقین کر رہے تھے اور ساتھ ہی مسٹر اوگلوی سے پنجابی میں کہا:۔

"اوگلوی! اوکھے گھر نیوندرہ پایا ای" (اوگلوی! تم نے مشکل گھرانے سے ٹکر لی ہے)

تیسری گرفتاری

ڈپٹی کمشنر لاہور نے قانون کی آڑ میں اپنی شکست کا انتقام لیتے ہوئے ۱۱۔ جولائی ۱۹۲۷ء اڑھائی بجے بعد دوپہر شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمان غازی کو دفتر پنجاب خلافت کمیٹی حجازی بلڈنگ بیرون دہلی دروازہ سے زیر دفعہ ۱۰۸ گرفتار کر لیا۔ گرفتاری سے پیشتر شاہ جی دہلی، لاہور، امرتسر اور لدھیانہ کے اضلاع میں تقریریں کر کے پنجاب کے مسلمانوں کو توہین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقام پر آمادہ کر چکے تھے۔

دفعہ ۱۰۷ کے تحت قانون کا منشا ادھورا دیکھ کر شاہ جی پر دفعہ ۱۰۸ کے تحت بھی مقدمہ چلایا گیا۔ انہیں حکم ہوا کہ تین ہزار کی ضمانت اور تین ہزار کا مچلکہ دے کر دورانِ مقدمہ رہا ہو سکتے ہیں۔ لیکن شاہ جی نے نہ صرف فرنگی قانون کی یہ رعایت ٹھکرا دی بلکہ عدالت میں اپنا

بیان اور مقدمہ میں صفائی دینے سے بھی انکار کر دیا۔ سماعت مقدمہ تک شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی لاہور بورسٹل جیل میں رہے۔ مسلسل چار روز کی یک طرفہ کارروائی کے بعد شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی کو ایک ایک سال کی قید بامشقت کی سزا دے کر شاہ جی کو رُہتک جیل منتقل کر دیا گیا۔

مولانا ظفر علیخاں کی ایک نظم کا شعر انہی دنوں کی یادگار ہے ؎

بتو غازی کی غیرت لاج رکھ لی جس نے ملّت کی
عطاءاللہ کا ہیبت رُبا ایمان ہو جاؤ

سوامی شردھانند کا قتل

شاہ جی کی گرفتاری اور سزا کے بعد فرنگی اور ہندو کے خلاف نفرت کو مزید ہوا ملی اور یہ تحریک سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ ان دنوں مسلمانانِ ہند کے حسب ذیل مطالبات تھے۔

۱۔ حکومتِ برطانیہ ایک ایسا قانون وضع کرے۔ جس سے بانیانِ مذاہب کی عزت محفوظ ہو۔

۲۔ جسٹس کنور دلیپ سنگھ کو اس کی ذمہ داریوں سے فوراً علیحدہ کر دیا جائے۔

۳۔ سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو جیلوں سے رہا کیا جائے۔

اس ہنگامی تحریک کے نتیجہ میں والئی افغانستان غازی امیر امان اللہ خان نے حکومت برطانیہ کو حسب ذیل مفہوم کا ایک خط لکھا۔

"اگر برطانوی ہند میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عزّت محفوظ نہیں رہ سکتی تو ہمیں برطانیہ کے ساتھ کیے گئے معاہدوں پر از سرِ نو غور کرنا پڑے گا۔"

مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کو بھی انہی دنوں گرفتار کیا گیا۔

شدھی و سنگھٹن کے برگ و بار پھر ابھر کر سامنے آ گئے۔ سوامی شردھانند نے اپنے

روزنامہ "تیج" دہلی میں یہ جذباتی نعرہ لگایا کہ میں عنقریب دہلی جامعہ مسجد کے منبر پر شدھی کا جھنڈا لہراؤں گا۔ اس اعلان پر مسلمانوں میں اضطراب بڑھا۔ آخر مولوی عبدالرشید نے جو جامعہ مسجد کی سیڑھیوں پر پرانی کتب فروخت کیا کرتا تھا، سوامی شردھانند کو قتل کر دیا اور اسی جرم میں اسے ۱۴۔ نومبر ۱۹۲۷ء کو دہلی جیل میں پھانسی پر لٹکایا گیا۔

الغرض ان واقعات نے ہندوستان کو ایسی ڈگر پر ڈال دیا کہ خارِ مغیلاں بھی خونِ انسانی سے لالہ و گل کو رنگت بخشتے رہے اور اس راہ کی ہر شے نے خاتم الانبیاءؐ کے ناموس کی حفاظت کی۔

تعزیراتِ ہند میں ترمیم

غیر ملکی نظامِ حکومت غلام رعایا کو باہم دست و گریبان دیکھ چکا، آدمی کے لہو سے آدمیت کی ذلّت چمکنے لگی۔ دلوں کے انگارے بدبو دینے لگے، تو شاطرانِ فرنگ نے محکوم رعایا پر دستِ کرم کیا کہ تعزیراتِ ہند میں ترمیم کر کے دفعہ ۱۹۵ کا اضافہ کیا جس کی رو سے ہر ایسی تحریر و تقریر قانوناً جرم قرار دے دی گئی، جس سے کسی مذہب کے بزرگ یا بانی (REFORMER) کی اہانت کا پہلو نکلتا ہو۔ لیکن پہلے کی متنازعہ فیہ کتب کو ممنوع قرار نہ دیا۔

نہرو رپورٹ

۱۲۔ فروری ۱۹۲۸ء کو لارڈ برکن ہیڈ اور سائمن کمیشن کے جواب میں ہندوستانی رہنما دہلی میں جمع ہوئے۔ پنجاب کی نمائندگی چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی اور مولانا ظفر علی خاں نے کی۔ اس اجتماع میں سر علی امام، مسٹر شعیب قریشی، مسٹر اینے، مسٹر جیکر، سردار منگل سنگھ، سر تیج بہادر سپرو پر مشتمل ایک کمیٹی ترتیب دی گئی جس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ آگے چل کر نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔

اگرچہ سائمن کمیشن کی آمد پر مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد سے ہندوستانی رہنماؤں کی مساعی جمیلہ نے بگڑے ہوئے ماحول کو سنوارنے کی شب و روز سعی کی لیکن فضا میں تلخی بدستور

زہر گھول رہی تھی۔ انہی دنوں مئی ۱۹۲۸ء میں شاہ جی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور غازی عبدالرحمٰن امرتسری ایک ایک سال میعادِ اسیری گزار کر رہا ہوئے۔ ان کی آمد پر امرتسر شہر کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ مسلمانوں کے دلوں کے آئینوں میں شوق و محبت کی تصویریں آویزاں تھیں۔ سقف و بام پر خوشی کے آنسوؤں کی جھاریں لٹکا دیں۔ کوچہ و بازار محبوب رہنماؤں کی آمد پر مسکراہٹ کے موتی بکھیرنے لگے۔ گھروں میں عید اور دکانوں پر میلے لگ گئے۔ اس استقبال کی تیاریوں کی اطلاع نہ جانے کس طرح شاہ جی کو ملی کہ وہ اچانک یوں غائب ہوئے کہ ان کے ساتھی بھی انہیں تلاش نہ کر سکے۔ شاہ جی رات کے اندھیرے میں چھپ کر گھر پہنچ گئے۔

امرتسر ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے والے ہجوم کو شاہ جی کی یہ بے اعتنائی پسند نہ آئی۔ وہ مایوس بھی ہوئے اور ناراض بھی۔ اس کے باوجود مولانا حبیب الرحمٰن اور غازی عبدالرحمٰن کا جلوس اپنے وقار سے نکلا۔ ناموسِ رسالت کے محافظ جن راستوں سے گزرے نگاہیں فرشِ راہ اور دلوں نے عقیدت کے پھول برسائے۔

شاہ جی کی جلوس سے غیر متوقع غیر حاضری نے ان کے حلقہ احباب پر بھی اثر کیا۔ چنانچہ عام دوستوں نے باہم فیصلہ کیا کہ شاہ جی سے تعلقات منقطع کر لیے جائیں۔ اس فیصلے کے تحت احباب نے رخ پھیر لیا۔ شاہ جی جس دوست کے مکان پر جاتے وہ خدمت تو کرتے آؤ بھگت بھی کرتے لیکن خاموشی سے۔ چاہے گھنٹوں اس کے پاس بیٹھے رہیں۔ سارے گھر میں اور سارے حلقہ احباب میں بھی بے رخی اور بے نیازی کا عالم رہا۔ بازار سے گزرتے تو السلام علیکم کا جواب نہ ملتا۔ گھر سے نکل کر محلے میں آتے تو بچوں اور بوڑھوں تک میں مقاطعہ کی فضا پاتے۔

اسی طرح پندرہ دن گزر گئے۔ لیکن لبوں پر مہر خاموشی بدستور رہی۔ گویہ غصہ، ناراضگی، بے نیازی، بے رخی احباب کی ایک ادا کا نتیجہ تھی لیکن شاہ جی ایسے باغ و بہار آدمی کے لیے وبالِ جان بن گئی اور وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ مرنے مارنے پر اتر آئے۔ جن

دوستوں سے زیادہ قرابت تھی، وہاں زیادہ رنج ظاہر کرتے۔ آخر دوستوں نے بھی اتنی ہی سزا کافی سمجھ کر کٹڑہ مہاسنگھ کے میونسپل کمشنر میاں محمد شریف ٹھیکیدار کے گھر دعوت کا انتظام کیا اور اس مجلس میں شاہ جی نے جلوس سے غیر حاضری کے لیے حلقہ احباب سے معذرت چاہی یہ رنگین محفل جس میں اردو اور پنجابی کے شعرا بذلہ سنج حضرات شامل تھے، رات دو بجے تک جاری رہی۔

حیدر پہلوان کا مقدمہ باوجودیکہ نہرو رپورٹ کے ذریعے حسب ذیل فرقہ وارانہ فیصلے ہوئے۔

۱۔ جداگانہ انتخاب کو ہندوستان سے ختم کر دیا جائے۔

۲۔ مخلوط انتخاب کے ساتھ نشستوں کا تعین غیر مفید قرار دیا جائے۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں انتخاب کھلا رکھا جائے۔ نیز کسی فرقہ کے لیے نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔

۴۔ مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دینے سے انکار کر دیا گیا۔ البتہ اس تناسب پر فیصلہ ہوا جو صوبہ جاتی نشستوں کے فیصلے کی رو سے مرکز میں مسلمانوں کو حاصل ہو سکیں گی۔

لیکن ہندو مسلم کشیدگی برابر بڑھتی رہی اور سائمن کمیشن اپنا کام کرتا رہا۔ یہ دور قانونی موشگافیوں کا دور تھا۔ شاہ جی ان دنوں کچھ دیر کے لیے خانگی معاملات کی دیکھ بھال میں مصروف رہے۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمان قومی کارکنوں کی زندگی ہمیشہ ایک المیہ رہی ہے، بشرطیکہ وہ کارکن ہوں سوداگر نہ ہوں۔ گو پروان وہی لوگ چڑھے ہیں جنہوں نے دماغ اور ضمیر کا سودا کیا اور وقت نے بھی انہی کو حقیقت جانا۔ حالانکہ وہ افسانہ تھے لیکن آئینہ ٹوٹ کر بھی دیکھنے والے کو مایوس نہیں کرتا۔

انسان کا اگر اپنا ضمیر مطمئن ہو تو حالات کا بگاڑ راستے کی دیوار نہیں بنتے۔ کانٹے لاکھ سر

پھوڑیں پھول نکل ہی آتے ہیں۔ شاہ جی اگر مقبول ہو رہے تھے، یا شہرت ان کی پیشوائی کر رہی تھی تو ان کے سہارے تعلیم، دولت یا کوئی دوسرا طلسم نہیں تھا بلکہ خلوص، جذبۂ ایثار اور ایمان کی پختگی ایسی چیزیں تھیں، جو انہیں زمانہ پر فوقیت دے رہی تھیں۔ درویش کی زندگی کا مدار اس کی گوڈری تک ہوتا ہے۔ شاہ جی نے گھریلو حالات کو جلا دینے کے لیے وقت سے عاریتاً مہلت مانگی اور امرتسر پرانی گندم منڈی مائی والی مسجد میں صبح کا درس اور جمعہ کے خطبہ پر متعین ہو گئے۔ یہ گاڑی ایک معینہ مدت تک چلی۔

امرتسر میں سونا چاندی یا گوٹا کناری خریدنے والے زرگر محلوں میں عام گشت کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک غیر مسلم زرگر کوچہ حیدر پہلوان میں پھر رہا تھا کہ حیدر پہلوان کے بھائی محمد سرور نے اچانک اس کے سر پر لوہے کا ہتھوڑا دے مارا۔ آدمی کمزور تھا۔ ضرب کاری لگی اور وہ موقعہ پر ہلاک ہو گیا۔ ملزم محمد سرور کا دماغی توازن گزشتہ کئی برسوں سے درست نہیں تھا۔ اس کی اس حرکت نے سارے شہر کا امن خراب کر دیا۔ ملزم موقع پر گرفتار کر لیا گیا۔ واقعہ سے تیسرے روز ہمسایہ قوم نے حیدر پہلوان کو اصل ملزم قرار دے کر گرفتار کرا دیا۔

حیدر پہلوان سیرت اور صورت کے لحاظ سے اپنے فن میں منفرد پہلوان تھا۔ پنجاب اپنے اکھاڑے کے اس جیالے جوان پر جی جان سے فریفتہ تھا۔ ہندوؤں نے جیسے ہی حیدر کو قاتل ٹھہرا کر قانون کے حوالے کیا امرتسر کا مسلمان فریق بن کر سامنے آ گیا۔ عید کا تہوار بھی قریب تھا اور عید کے دوسرے روز حیدر نے کشتی لڑنی تھی۔ مقامی حکام اس حادثے کے باعث تعطل میں تھے۔ ہندو قوم نے دولت کے سہارے قانون کے سارے راستے مسدود کر دیے۔ پولیس کی ابتدائی رپورٹ میں حیدر پہلوان کا نام درج نہیں تھا اور یہی ایک راستہ ایسا تھا، جہاں ہندوؤں کی دولت کوئی رکاوٹ نہ بن سکی۔

مقدمے کی سماعت ڈپٹی کمشنر نے خود سنبھالی۔ ہمسایہ قوم نے لندن کے مشہور بیرسٹر مسٹر بیٹ مین کو وکالت کے لیے پیش کیا اور مسلمانوں نے سر محمد شفیع کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

مگر تہی دامنی اور خالی ہاتھ سر شفیع کے اونچے محل تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ غریب جان تو دے سکتا ہے مگر ایثار زر اس کے بس کا روگ نہیں۔ ایثار پیشہ جب دنیوی سرمائے سے عاری ہو جاتا ہے تو جذبات کا سودا کرنے لگتا ہے۔ کٹڑہ مہا سنگھ کے لوگوں نے شاہ جی سے گزارش کی کہ :-

"حیدر پہلوان کے مقدمہ میں مسلمانوں کی غربت کہیں اسلام کی شکست کا نشان نہ بن جائے۔"

تو شاہ جی آبدیدہ ہو کر چندہ مانگنے محلے میں نکل کھڑے ہوئے۔ شام تک امید نے ڈھارس بندھائی لیکن دریا خشک ہو جائے تو آنسوؤں کی روانی اس کی پیاس ختم نہیں کر سکتی۔ اگلے روز باغبانپورہ لاہور میں میاں سر محمد شفیع کے مکان کے سامنے چوک میں تقریر کرنے کا ارادہ لے کر شاہ جی لاہور پہنچے۔ منادی ہوئی۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ شاہ جی نے عشاء کی نماز کے بعد تقریر شروع کی تو صبح کے چار بج گئے۔ تقریر کے دوران حیدر پہلوان کی شخصیت، مقدمے کی نوعیت مسلمانوں کی بے بسی اور ہندوؤں کے اتحاد و دولت پر تبصرہ کیا، لیکن سر شفیع کا نام تک نہ لیا۔ آخر اذان کے وقت میاں سر شفیع بے اختیار ہو کر شاہ جی کے قدموں پر آگرے اور اسی وقت امرتسر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ دوسرے روز مقدمے کی پہلی پیشی تھی اور اس مقدمے کی چشم دید گواہ محلے کی لکھی دھوبن نامی ایک عورت تھی جس نے اپنی شہادت میں حیدر پہلوان کو موقع واردات پر غیر حاضر قرار دیا۔

ولایت سے آئے ہوئے مسٹر پٹ مین اور میاں سر محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لاء آمنے سامنے کھڑے تھے، عدالت سے باہر ہزاروں مسلمان جمع تھے کہ حیدر پہلوان ہتھکڑی کے ساتھ عدالت میں لائے گئے، جسے دیکھتے ہی مسلمانوں کی چیخیں نکل گئیں اور ساتھ ہی ہندوؤں نے اتنی سی کامیابی پر "ہر ہر مہادیو" کے نعرے بلند کیے۔

شاہ جی عدالت میں نہیں آئے تھے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ "میں اپنے اللہ کے حضور سر بسجود

ہوکررد تا رہا اور مسلمانوں کی کامیابی کے لیے دعا کرتا رہا۔"

لکھی دھوبن کی گواہی کے بعد میاں سر محمد شفیع نے کہا کہ استغاثہ کی ابتدائی رپورٹ اور چشم دید گواہ کے بعد میرا عدالت سے صرف ایک ہی سوال ہے۔

"کیا عدالت کے نزدیک پولیس زیادہ معتبر ہے یا کوئی دوسرا گواہ؟

عدالت۔ "پولیس"!

سر شفیع۔ " تو پھر پولیس کی ضمنی یا ابتدائی رپورٹ میں حیدر پہلوان کا نام بطور ملزم کے درج نہیں بلکہ محمد سرور کا نام ہے۔ لہٰذا میری عدالت سے درخواست ہے کہ ملزم حیدر پہلوان نہیں بلکہ محمد سرور ہے اور بس"۔

استغاثہ کے ایک گواہ کی شہادت اور سر محمد شفیع کے دلائل سننے کے بعد عدالت نے دوسرے فریق کے دلائل سنے بغیر حیدر پہلوان کو مقدمے کی پہلی پیشی پر باعزت بری کر دیا اور محمد سرور کو پاگل قرار دے کر غیر معینہ مدت کے لیے پاگل خانے بھیج دیا۔

حیدر پہلوان کو عدالت سے بری ہوتے ہی پچھلے دروازے سے نکال کر گھر بھیج دیا۔ جب مسلمانوں کو یہ خوشخبری ملی تو وہ دیوانے ہو گئے لیکن اس دیوانگی میں انہوں نے کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی۔

شاہ جی اور مسلمانانِ امرتسر اپنی اس کامیابی پر بہت مسرور ہوئے۔ یہ ستمبر ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے۔

پیر کرم شاہ

جب قوموں کا گزر انحطاط کے دور سے ہوتا ہے تو راستے کی ہر پگڈنڈی انہیں منزل کا نشان دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ پگڈنڈی محض راستہ ہوتا ہے منزل نہیں۔ لیکن بھٹکے ہوئے راہی ہر موڑ کو سنگِ میل سمجھتے ہوئے اپنے قیاس میں کھو جاتے ہیں۔

اس دور کا مسلمان عقیدے کی پختہ چٹان سے پھسل کر ان پتھروں پر آگرا ہے جن سے تراشے ہوئے صنم خدائی کے دعویدار ہیں۔ مخلوق اپنے خالق سے انحراف کر کے بغاوت کے اس دستور

کو اپنا رہی ہے، جس کی ہر تجویز انسانیت سے ماورا معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شعبدہ
صرف ہاتھ کی صفائی سے دل و نظر کو فریب دینے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

۱۹۲۸ء کی نبضیں چھوٹ رہی تھیں کہ امرتسر کا مسلمان پیر کرم شاہ کے آستانے پر سجدہ ریز تھا۔
مسلمان عورت کا آئینہ عصمت اس دہلیز سے ٹکرا کر چور چور ہو چکا تھا۔ ایمان و توحید کی قندیلیں مند
کر کفر کے تارِ عنکبوت میں اُلجھ رہا تھا۔

تیس بتیس کا سن، سرو قد، سُرخ و سپید رنگت جیسے میدے میں سندھور گوند کر تپایا گیا ہو۔
کشادہ پیشانی، چشم آہو میں بلا کی چمک، جیسے کسی نے موتی کوٹ کر بھر دیئے ہوں، تیکھی ناک،
جیسے تلوار کی دھار، عناب کی طرح سرخ ہونٹ، سر پر لمبے اور سنہری بال ایسے جال تھے، جن
میں راہ چلتی جوانیوں کا پھنس جانا معجزہ نہیں تھا۔ ان سب پر سیاہ ریشم کے عربی کاٹ کے
لباس کی سج دھج ۔ یہ تھا پیر کرم شاہ! جس کی شہرت نے گھروں کے گھر اس کے قدموں میں لا
ڈالے تھے۔ یہ اکثر چہرے پر نقاب رکھتا اور ملنے والوں کو دیدار کی ہوس رہتی تھی۔ امرتسر
قلعہ بھنگیاں کو چہ ستاریوں میں رہائش کے دنوں اس کا چرچا خوشبو کی طرح پھیل گیا۔ امرتسر
کا سرکاری خطاب یافتہ طبقہ، شال مرچنٹ، پشمینہ کے سوداگر اس کے میزبان تھے۔ لباس
گفتگو، نقش و نگار اور سرکاری رکھ رکھاؤ نے کرم شاہ کے متعلق مختلف قیاس آرائیوں
کو ہوا دی۔ کمزور اعتقاد مسلمان روحانی پیر سمجھ کر پوجا کرنے لگا۔ اور اکثر کی رائے تھی کہ کرم شاہ
درحقیقت وہی "کرنل لارنس" ہے جس نے عربوں میں انقلاب برپا کیا تھا۔ اس رائے کے
باعث سرکاری خطابات کی چاہت کے لوگ کرم شاہ کے گرد زیادہ تعداد میں جمع ہو گئے تھے
امیروں کی بھیڑ دیکھ کر غریبوں کے ایمان بھی متزلزل ہو گئے۔ فریب خوردہ عوام نے
آستانہ کرم شاہ پر جبہ سائی کی انتہا کر دی۔ اولاد سے محروم عورتوں کی [illegible]

اجازت نہیں۔ گو شاہ جی کا ماتھا یہیں سے ٹھنکا لیکن بادلِ نخواستہ دوسرے دن کا قصد لے کر
واپس لوٹ آئے۔ دوسرے روز گئے تو موصوف سے دو گھنٹے تنہائی میں سیر حاصل گفتگو
کے بعد شاہ جی مسکراتے ہوئے باہر آئے اور اگلے روز چوک خراسیاں (متصل ڈیرہ کرم شاہ) میں
اہلِ امرتسر کو خطاب کرتے ہوئے شاہ جی نے کہا:۔

"راہِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے مسلمانو! ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ جس
آدمی کو تم نے روحانی پیشوا یا انگریزی جاسوس خیال کر لیا ہے یہ دونوں میں
سے کچھ نہیں، برطانوی جاسوس نہ تو گلی، محلوں میں قیام کرتے ہیں اور نہ اس
طرح کی بھیڑ انہیں راس آتی ہے، یہ روحانی آدمی بھی نہیں۔ یہ محض نفس
پرست انسان ہے۔ ممکن ہے آج میری باتیں تمہیں کڑوی معلوم ہوں،
لیکن عنقریب سنو گے کہ یہ کسی معصوم لڑکی کو اغوا کر کے لے بھاگا۔ اگر تم
اپنے ایمان نہیں بچا سکتے تو گھروں کی عزت کی حفاظت کرو۔ عورتوں کو وہاں
جانے سے منع کر دو۔

مجھ سے پوچھتے ہو تو میری نظروں نے فسق و فجور کے علاوہ وہاں اور
کسی چیز کا اندازہ نہیں لگایا۔ وہاں روحانیت کی نہیں، معصیت کی تربیت
دی جاتی ہے۔ جس شخص کو تم نے پیر بنا رکھا ہے، یہ بہت بڑا بدمعاش ہے۔
انشاءاللہ میں بہت جلد اس کا سارا طلسم ختم کر دوں گا۔ تم چاہے آج میرا ساتھ
نہ دو لیکن کل میرے ساتھی ضرور بنو گے۔

شاہ جی کی یہ تقریرات دو بجے تک جاری رہی اور دوسرے دن اس سے تھوڑی دور چوک
کٹڑہ سفید میں جلسے کا اعلان کیا گیا۔ اس جلسے میں حاضرین کا اندازہ دو لاکھ سے اوپر بیان
کیا جاتا ہے۔ پنجابی کے مشہور انقلابی شاعر خواجہ عبدالرحیم عاجز نے "دو سہیلیوں کی باہم
تکرار" کے عنوان سے ایک تمثیلی نظم اس جلسہ کے آغاز میں پڑھی، جس کے دو شعر یاد ہیں:۔

چل درشن کریے نی اج رل کرم شاہ پیر دے
نین گھر گھر وچ اڑنیے اج پوچھے جس بے پیر دے
مردنگھن او تھے پچھ کے اندر اتے تینویاں لنگدیاں کھلیاں
اساں سنیا او تھے انج او کھیڈن جینوے ڈنڈے نال گلیاں
او تھے نقشے دسدے نیں اساں سنیا رانجھن ہیر دے
چل درشن کریے نی اج رل کرم شاہ پیر دے

شاہ جی کی تقریر صبح اذان کے وقت ختم ہوئی (افسوس ہے کہ تلاش کے باوجود یہ تقریر نہ مل سکی)

ان تقاریر کے بعد کرم شاہ نے اچانک امرتسر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور بمبئی چلا گیا۔ وہاں اس نے چند تجارت پیشہ لوگوں پر اپنا وار کیا۔ لیکن بہت جلد شراب نوشی اور دوسری بدمعاشیوں کا انکشاف ہونے کے بعد یہ لاہور چلا آیا۔ یہاں اس کے گرد اسی قماش کے لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ پھر یہ اس قدر بدنام ہوا کہ لاہور میں لالہ لاجپت رائے کی ارتھی کے جلوس کے موقع پر (جو سائمن کمیشن کے خلاف احتجاجی جلوس میں لاٹھیوں سے زخمی ہو کر فوت ہوئے تھے) کرم شاہ کو عوام نے کار میں دیکھ لیا اور اس قدر پٹائی کی کہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ اس ہنگامے کے بعد یہ کشمیر چلا گیا۔

کرم شاہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کہاں چلا گیا؟ یہ خاک کہاں سے اڑی اور کہاں جا کر بیٹھ گئی۔ اس اندھیر گردی میں کتنی عصمتیں لٹیں؟ کتنے ایمان ضائع ہوئے؟ انسانیت کو کہاں کہاں شرمندہ ہونا پڑا؟ زمانے کے پاس اس کی کوئی فائل نہیں۔ حالات واقعات پر اسی طرح خندہ زن رہے۔ لیکن شاہ جی کی آواز سے جو گونج پیدا ہوئی تھی، اس کی صدائے بازگشت ہنوز سنائی دیتی ہے "مسلمانو ——! ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی"

۱۹۲۹ء

زندگی کے سن و سال جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں، آدمی کی ذمہ داریاں بھی اسی قدر ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ انسانی شعور کے بالغ ہونے تک گزشتہ زندگی کے راہ و رسم احساس کے سہارے پروان چڑھتے ہیں۔ اگر یہ کڑی درمیان میں نہ ہو تو ساری زنجیر ٹوٹ کر رہ جائے۔

اس سال شاہ جی کی عمر اڑتیس سال کے قریب تھی لیکن تبلیغی اور سیاسی ذمہ داریوں کا بوجھ اس شدت سے آن پڑا کہ ان کے احساس نے انہیں جوانی کی سرحدوں سے دور کر دیا تھا۔ حالانکہ یہی دن ایّام بہاراں کہلاتے ہیں۔ جو راستہ روزِ ازل سے انہوں نے منتخب کیا تھا وہاں بہاروں کا گزرنا ممکن تھا۔ اگر ۱۹۲۹ء کے سیاسی اور مذہبی واقعات میں سے شاہ جی کے کردار کو الگ کر لیا جائے، تو اس سال کی تاریخ رنگ و روغن سے تہی معلوم ہوتی ہے یہی سال دراصل شاہ جی کی شہرت کو کابل کی دیواروں سے راس کماری تک لے گیا ورنہ اس سے پیشتر پنجاب، سرحد اور یوپی کے چند اضلاع تک ہی متعارف تھے۔

شاتمِ رسولؐ کا قتلِ عام

ایک طرف سائمن کمیشن کے ارکان ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایسی بُو سونگھ رہے تھے جس سے انہیں اپنے لیے سکون میسر نہیں تھا، دوسری طرف مہاشہ راج پال کے بری ہونے پر فرقہ پرست ہندوؤں نے منظم سازش کے تحت تحریک شاتم رسول کو ہندوستان میں ہوا دی، جس سے آریہ سماجی ہندوؤں کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے پیغمبر آخرالزماں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پہلے سے زیادہ تحریر و تقریر پر ہنگامہ شروع کر دیا۔

ہندوستان کے سیاسی حالات گو ان حرکات پر نفرین بھیج رہے تھے، اگر ہندو اکثریت کے رہنما مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے منصوبے باندھ رہے تھے اور ان دنوں اس قسم کی گفتگو کھلم کھلا سننے میں آ رہی تھی۔

۱ ——— جب مسلمانوں کا تعلق عرب سے ہے تو یہ کیوں وہاں نہیں چلے جاتے۔

یہاں ان کا کیا رکھا ہے۔

۲ ——— ہندو جاتی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مسلوں کو سمندر پار بھیج کر ہی دم لے گی۔

۳ ——— شدھی کا جھنڈا اب دہلی کی جامعہ مسجد پر لہرائے گا۔

۴ ——— (شہنشاہ) اورنگ زیب عالمگیر نے جس تلوار سے یہاں کے ہندوؤں کو بھرشٹ (مسلمان) کیا تھا ہم پرماتما کی سوگند (قسم) کھا کر کہتے ہیں کہ وقت آنے پر اسی تلوار سے مسلوں کو شدھ (ہندو) کریں گے۔ وغیرہ!

دوسری طرف مسلمان رہنما چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی، مولانا ظفر علی خاں، سکھ رہنماؤں کو ناراض کر کے نہرو رپورٹ پر لکھنو میں دستخط کر چکے تھے جس کے نتیجے میں پنجاب کا مسلمان ان پر ناراض تھا۔ روزنامہ "سیاست" کے ایڈیٹر سید حبیب مخالفت میں پیش پیش تھے۔ گو یہ تحریک صرف لاہور تک محدود رہی لیکن صحافت کا مرکز ہونے کے باعث اس کے اثرات سارے ہندوستان میں پھیلے۔ چودھری افضل حق، مولانا ظفر علی خاں، مولانا داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور شاہ جی نے سارے پنجاب میں نہرو رپورٹ کے اثرات سمجھائے۔

مسلمانوں کے دو گروہوں میں یہ چپقلش جاری تھی کہ مہاتما گاندھی اور پنڈت مدن موہن مالویہ نے ایک مشترکہ اعلان میں کہا۔

"نہرو رپورٹ کے فیصلے میں سکھوں سے ناانصافی کی گئی ہے۔"

اس اعلان سے سکھوں اور ہندوؤں میں اتحاد کی ایک نئی لہر اٹھی اور سارے ملک میں پھیل گئی۔ انہی دنوں مسلمان رہنماؤں نے بھی جو نہرو رپورٹ پر دستخط کر آئے تھے اعلان کیا۔

"چونکہ مسلمان قوم نہرو رپورٹ کے فارمولے کو قبول نہیں کرتی لہٰذا ہم اس کی ذمہ داری سے دستبردار ہوتے ہیں۔"

گاندھی اور مالویہ کے اعلان کے بعد پنجاب کے رہنماؤں کے نہرو رپورٹ سے انکار پر

سائمن کمیشن کا منشا پورا ہو چکا تھا۔ لیکن وہ ہندوستانیوں کا مزید تماشا دیکھنے کے لیے یہاں ٹھہرے رہے۔ ان واقعات سے ایک طرف ہندوستان کے مشترک مقصد کو نقصان پہنچا، دوسری طرف انگریز حکمرانوں کی سیاست گری کامیاب رہی۔

ایسے حالات میں اوّل الذکر گروہ (آریہ سماج) نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے کا فیصلہ پختہ کر لیا۔ اس سلسلے میں وہ ایسی ایسی تحریریں سامنے لائے کہ مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے۔ غلامی کا جوا ان کی گردنوں پر کوہ ہمالہ سے بھی زیادہ بوجھل معلوم ہونے لگا۔ غم اور غصے کے ملے جلے جذبات سے وہ ہندوؤں کا مقابلہ کرتے رہے۔ آخر انہی دنوں شاہ جی نے عصمتِ انبیاء کے تحفظ کا فیصلہ کیا۔ درویش اپنی گودڑی سنبھال کر بے سروسامانی کے عالم میں نکل کھڑا ہوا۔ قانونِ افرنگ اور دولتِ ہنود اس کے ارادوں میں نہ تو کانٹے بکھیر سکی اور نہ ہی ان کے قدموں کی رفتار مدھم ہو سکی۔

"مسلمانو! میں تمہاری سوئی ہوئی غیرت کو جھنجھوڑنے آیا ہوں۔ آج کفار نے توہینِ پیغمبرؐ کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انہیں شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسلمان مر چکا ہے۔ آؤ اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔ عزیز نوجوانو! تمہارے دامن کے سارے داغ صاف ہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔ گنبدِ خضرا کے مکینؐ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ اُن کی آبرو خطرے میں ہے۔ اُن کی عزّت پر کتے بھونک رہے ہیں۔ اگر قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے طالب ہو تو پھر نبیؐ کی توہین کرنے والی زبان نہ رہے یا سننے والے کان نہ رہیں۔"

ان خیالات کو شاہ جی نے برصغیر کے مسلمانوں میں بیان کیا۔ وہ شب و روز دیوانوں کی طرح تقریریں کرتے۔ گاؤں، قصبات، شہر اور بستیوں کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے منجمد خون میں حرارت پیدا ہوئی۔ بس پھر کیا تھا، شیر کی طرح بپھرا ہوا مسلمان گستاخ ہندوؤں کی تلاش کرنے لگا۔ نگاہیں جنت کی تلاش میں موت سے ہمکنار ہونے کو

بیقرار نظر آنے لگیں۔ دلوں میں شوقِ شہادت کی لذت محسوس ہونے لگی۔ خرد مسکراتی رہی مگر عشق منزل کی جانب رواں دواں رہا۔ اس طرح شاہ جی نے مسلمان نوجوان کو ابھار کر ایسے مقام پر لا کھڑا کیا کہ اس کے آگے دو ہی راستے تھے، یا تو ہندوستان میں داعی اسلام کی عزت ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائے یا پھر غیر مسلموں کو آئندہ جرأت نہ ہو کہ وہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر زبانِ طعن دراز کریں۔

دلوں کے اس فیصلہ کن مقام پر پہنچ کر سب سے پہلے ۶ راپریل ۱۹۲۹ء کو لاہور کے ایک بڑھئی نوجوان غازی علم الدین نے دوپہر کے وقت لاہور میں کتاب "رنگیلا رسول" (نعوذ باللہ) کے ناشر مہاشہ راج پال کو اس کی دکان (ہسپتال روڈ) میں قتل کر دیا۔

اس مقدمہ میں شاہ جی کی خواہش پر علم الدین نے راج پال کے قتل کا اقرار کر لیا تھا۔ حالانکہ مسٹر محمد علی جناح سمیت تمام وکلاء جو اس اہم کیس کی پیروی کر رہے تھے کی خواہش تھی کہ علم الدین ایسا نہ کرے۔

ایک خوفناک دھماکہ

غازی علم الدین کی گرفتاری کی سرخیاں ابھی اخبارات سے ماند نہیں پڑی تھیں کہ ۸۔ اپریل ۱۹۲۹ء کو دہلی سنٹرل اسمبلی میں بم کا ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ جب اس دھوئیں کے بادل چھٹے تو اسمبلی ہال کی گیلری پر دو نوجوان کھڑے تھے۔ سردار بھگت سنگھ اور بنگال کے مسٹر بی، کے، دت۔ اسمبلی ہال کی عمارت کو کافی نقصان پہنچا۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ممبران جو اس بانتہ ہو کر کچھ تو فرنیچر کے نیچے پناہ گزین تھے اور باقی ہال چھوڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔

۸۔ اپریل ۱۹۲۹ء کو سنٹرل اسمبلی میں جس کی صدارت مسٹر وٹھل بھائی پٹیل کر رہے تھے، پبلک سیفٹی بل پیش ہونے والا تھا کہ یہ حادثہ پیش آیا۔ دونوں ملزم گرفتار کر لیے گئے۔

ان مذہبی اور سیاسی قسم کے تشدد آمیز واقعات نے ہندوستان کے رہنماؤں اور عوام کو الگ الگ دھڑوں میں تقسیم کر دیا۔ عدم تشدد کی پالیسی کالعدم قرار دی جانے لگی اور نوجوان

جو سیاسی رہنماؤں کی نرم پالیسی سے تنگ آ چکے تھے، آتشیں اسلحہ کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔
ہندوستان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ہر انگریز کو جان کے لالے پڑ گئے چنانچہ
۱۴-اپریل کو سائمن کمیشن کے ارکان حالات کا مزید انتظار کیے بغیر لندن واپس چلے گئے۔

خلیفہ قادیاں کا خطبہ

انہی افراتفری کے دنوں خلیفہ قادیاں مرزا بشیر الدین محمود کو بھی سوجھی کہ انہوں نے جمعہ کے خطبہ میں غازی علم الدین کے متعلق حسب ذیل خطبہ دیا۔

"وہ خبیث الفطرت اور گندے لوگ جو انبیاء کو گالیاں دیتے ہیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ ان کی قوم اگر اپنے اندر دین داری اور اخلاق رکھنے کی مدعی ہے تو اس کا فرض ہے کہ ایسے افعال کی پورے درد کے ساتھ مذمت کرے۔ اسی طرح اس قوم کا، جس کے جوشیلے آدمی قتل کرتے ہیں خواہ انبیاء کی توہین کی وجہ سے ہی وہ ایسا کریں، فرض ہے کہ پورے زور کے ساتھ ایسے لوگوں کو دبایا جائے اور ان سے اظہار برأت کرے۔ انبیاء کی عزت کی حفاظت قانون شکنی کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ وہ نبی بھی کیسا نبی ہے، جس کی عزت بچانے کے لیے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں۔ جس کو بچانے کے لیے اپنا دین تباہ کرنا پڑے۔ یہ سمجھنا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت کے لیے قتل کرنا جائز ہے، سخت نادانی ہے۔ وہ لوگ جو قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں وہ بھی مجرم ہیں اور اپنی قوم کے دشمن ہیں اور جو ان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے وہ بھی قوم کا دشمن ہے۔ میرے نزدیک تو اگر یہی شخص راجپال کے قاتل سے جو گرفتار ہوا ہے تو اس کا سب سے بڑا خیر خواہ وہی ہو سکتا ہے جو اس کے پاس جائے اور اسے سمجھائے کہ دنیوی سزا تو اب تمہیں ملے گی ہی لیکن قبل

اس کے کہ وہ ملے تمیں چاہیے کہ خدا سے صلح کرلو۔ اس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اسے بتایا جائے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے۔"

(۱۹۔ اپریل ۱۹۲۹ء اخبار الفضل قادیاں)

ان دنوں جب کہ مسلمان نوجوان تحریک شاتم رسول کی بیخ کنی کے لیے کفن بردوش ہو کر میدانِ عمل میں آچکے تھے خلیفہ قادیاں کا مندرجہ بالا بیان ان نوجوانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف تھا جو توہین رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہندوانہ سازش کو بے نقاب اور ختم کرنا چاہتے تھے۔

اپریل کا پورا مہینہ اسی ہماہمی میں گزرا اور مئی کے شروع میں غازی علم الدین کا مقدمہ زیر دفعہ ۳۰۲ عدالت میں پیش ہوا۔ استغاثہ کی ابتدائی شہادتوں کے بعد غازی علم الدین نے اپنے بیان میں کہا۔

"میں اس عدالت میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ میں نے کتاب رنگیلا رسول کے ناشر راجپال کو قتل کیا ہے۔ اس لیے کہ کتاب مذکور سے میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت توہین ہوئی تھی۔ راج پال کو اپنے اس فعل پر نہ ندامت تھی اور نہ افسوس۔

اگر میں اس مقدمے میں بری کر دیا گیا تو میں توہین رسول کرنے والے کو پھر قتل کروں گا۔"

اس اقبالِ جرم کے بعد ۲۲ مئی ۱۹۲۹ء کو سیشن جج کی عدالت سے غازی علم الدین کو سزائے موت کا حکم ہوا۔

۱۵۔ جولائی کو ہائی کورٹ نے بھی اپیل خارج کر دی۔ پھر پریوی کونسل نے بھی فیصلہ بحال رکھا۔ آخر ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو میانوالی جیل میں غازی علم الدین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

مسلمانانِ لاہور کے مطالبے پر ۱۷۔ نومبر کو لاش لاہور لائی گئی اور لاکھوں مسلمانوں نے نمازِ جنازہ کے بعد اشک بار آنکھوں سے عاشقِ رسولؐ کو قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک کیا۔

شردھانند کے بعد راج پال کے قتل نے گستاخ زبانوں کو قدرے لگام دے دی۔ مگر کفر کے منظم فیصلے میں کوئی لچک نہ آئی۔ غازی علم الدین کی شہادت نے قتل کے واقعات کو ہندوستان بھر میں مسلسل ہوا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قصور میں محمد صدیق نے پالے شاہ کو، کلکتہ میں محمد عبداللہ اور عبدالعزیز نے لاہور سے جاکر بھولارام کو، کراچی میں عبدالقیوم نے نتھورام کو، جہلم میں غلام محمد نے اپل سنگھ کو، پلول ضلع حصار کے سکھ ڈاکٹر کو معافی مانگنی پڑی اور کیمبل پور میں عبدالمنان نے پیارے لال کو قتل کیا۔

مندرجہ بالا تمام نوجوانوں کو سزائے موت ہوئی اور صرف آخرالذکر عبدالمنان کو سیشن جج مسٹر ڈی۔ جی۔ اکھوسلہ نے سات سال کی سزا دی اور فیصلے میں لکھا کہ کوئی مسلمان توہینِ رسولؐ برداشت نہیں کر سکتا۔

تحریک شاتمِ رسول میں قتال کا یہ سلسلہ ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ ان مسلسل اور پیہم واقعات نے کفر کو اپنے فیصلوں پر نظرِ ثانی کے لیے مجبور کر دیا۔

شاہ جی کی یہ تحریک کہ "توہینِ رسول کرنے والی زبان نہ رہے یا توہینِ رسول سننے والے کان نہ رہیں"۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک گاہے گاہے اپنا کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ گستاخ زبانیں ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دی گئیں۔ وہ پھانسی کے رسّے اور دار کے تختے چوم لینے کے قابل ہیں جن کے ذریعے ان نوجوانوں کو موت کی سزا دی گئی جنہوں نے شاتمِ رسول کے ناپاک جسم کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا کر اپنے لیے شہادت کا جام قبول کیا۔ ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ڈیرہ غازی خاں

تحریک شاتمِ رسول اندر اندر اپنا کام کر رہی تھی کہ شاہ جی کو ڈیرہ غازی خاں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ۱۹۲۹ء کے وسط کی بات ہے۔ شاہ جی اس علاقہ کے اندرونی حالات سے ناواقف اور بے خبر تھے۔ غیر ملکی اقتدار کے باعث اس ضلع کی مسلم آبادی ایک طرف تمن داروں اور دوسری طرف ہندو ساہو کاروں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔

سردار احمد خاں پتافی اس ضلع کے مشہور زمیندار اور اہلِ دل مسلمان تھے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا لیکن اپنے ضلع کے مذہبی حالات سے غیر مطمئن تھے۔ جب انہیں شاہ جی کی آمد کا علم ہوا تو اپنے گھر (راجن پور ڈیرہ غازی خاں) سے چند مخلص نوجوانوں کا ایک وفد لے کر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

۱ ——— اس ضلع کی دور افتادہ بستیوں میں یہ رواج پڑ چکا ہے کہ غریب مسلمان اپنی ضرورتوں کے لیے ہندو ساہو کار کے پاس معمولی رقم کے عوض اپنی بیٹیاں رہن رکھتا ہے اور قرض مع سود کی واپسی تک لڑکی ہندو ساہو کار کے پاس رہتی ہے اور اکثر ایسا ہوا کہ وہاں اس کے ہاں اولاد بھی پیدا ہوئی۔

۲ ——— ڈیرہ غازی خاں کے مسلمانوں نے ۱۸۶۲ء کے بندوبست میں فرنگی عدالتوں میں اپنے آپ کو قرآن کریم کی بجائے رواج کا پابند لکھوایا، جس کے باعث انہوں نے اپنی بیٹیوں کو جائداد سے محروم قرار دیا ہے جب کہ قرآن کریم سورہ نساء میں بیٹی کو بھی باپ کی جائداد کا وارث قرار دیتا ہے۔

۳ ——— ضلع کے تمن داروں نے اپنی تفریح طبع کے لیے کتے اور سؤر پال رکھے ہیں۔ جب یہ لوگ موج میں آتے ہیں تو ان جانوروں کے درمیان لڑائی کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ اگر کتا جیت جائے تو اس کا جلوس نکالتے ہیں اور سؤر کو مار کر اس کے گوشت میں بہترین قسم کے بیگمی چاول ڈال کر پلاؤ پکا کر کتے کو کھلاتے ہیں۔

(شاید یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں ایک مدت سے اچھی قسم کے چاول کی پیداوار ناپید ہو چکی ہے)

مندرجہ بالا واقعات کے بعد سردار احمد خاں تپانی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دل کے ساتھ زبان اور نظر بصیرت عطا کی ہے۔ اگر آپ نے اس ضلع کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف توجہ نہ کی تو عنداللہ آپ مجرم ہوں گے۔ میری دولت اس کام کے لیے آپ کی پوری طرح معاون ہو گی۔

شاہ جی حالات سن کر زار و قطار رونے لگے اور سردار احمد خاں سے وعدہ کیا کہ میں جب تک زندہ رہوں گا، اس علاقہ کے مسلمانوں کی اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ چنانچہ شاہ جی ہر سال جون اور جولائی کے تپتے ہوئے موسم میں جب کہ یہاں کا کسان اور مزدور پیشہ طبقہ فصل کی کٹائی اور بٹائی سے فارغ ہوتا تھا اس ضلع میں تشریف لے جاتے۔ شہری آبادیوں سے دور آبادکاروں کی بستیوں میں دوپہر کے وقت ان کی زبان میں خطاب کرتے۔ دس دس اور بیس بیس کوس سے آئے ہوئے دیہاتی شاہ جی کی باتیں سنتے۔ گھنٹوں خطاب کرنے کے بعد شاہ جی ان سے سوال کرتے۔

"میڈی کائی گال سمجھ گدھی ہا"۔ (میری کوئی بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے)

اگر جلسے میں ایک دیہاتی نے بھی کہہ دیا،

"سائیں کو" یعنی کوئی نہیں

تو شاہ جی پھر اس ایک دیہاتی کو سمجھانے کے لیے سارے مجمع سے اسی طرح گھنٹوں خطاب کرتے۔ جب تک پورا مجمع بات سمجھ نہ لیتا تقریر ختم نہ کرتے۔

اس طرح زندگی کے تیس برس مسلسل ڈیرہ غازی خاں کے عوام کو مختلف اوقات میں خطاب کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمن داروں نے کتے اور سوروں کی پرورش سے توبہ کر لی۔ اس علاقہ کے وڈیروں سے روپیہ لے کر غریب مسلمان لڑکیوں کو ہندو ساہوکاروں کے

چنگل سے نجات دلائی۔ شہری اور دیہاتی مسلمان کو مجبور کیا کہ شریعت کی رو سے اپنی جائیداد میں سے لڑکیوں کو بھی حصہ دیں۔ قانون تو تبدیل نہ ہو سکا لیکن ڈیرہ غازی خاں اور ضلع مظفرگڑھ کے اکثر لوگوں نے شریعت کے اس قانون کی پیروی شروع کر دی۔ شاہ جی جن دنوں اس علاقے کا دورہ کرتے، گرمی کی شدت سے ان کے تمام جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آئیں۔ اس کے باوجود دور دراز ایسی بے آب و گیاہ بستیوں میں جاتے جہاں کے لوگ پانی کی قلت کی وجہ سے مجبور ہو کر جوہڑ کا پانی پیتے اور کھانے کے لیے انہیں پیاز، اچار یا مسور کی دال میسر تھی۔ جن گھروں میں گوشت یا دوسری بہتر خوراک میسر آ سکتی تھی، شاہ جی نے ان گھرانوں سے یہ کہہ کر ہمیشہ اجتناب کیا۔

"میں جن لوگوں کو سمجھانے آیا ہوں، اگر ان کے ساتھ گھل مل نہ جاؤں تو ان پر میری بات کا اثر نہیں ہو سکتا۔"

حالانکہ یہ ضلع پیر پرستی میں پنجاب کے تمام اضلاع پر سبقت رکھتا ہے اور شاہ جی چاہتے تو یہاں کی غربت اور عوام کی سادگی سے پورا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ علاقے کے تمن دار انہیں سونے کے برابر وزن کرتے لیکن وہ دیہاتیوں کے ساتھ کھاتے پیتے اور انہی کے گھروں میں ٹھہرتے، جہاں ایک طرف ڈھور ڈھنگر بندھے ہوتے اور تمام کمرہ گوبر کی بدبو سے اٹا ہوتا مگر شاہ جی کی پیشانی پر کبھی شکن نہ پڑتی۔ تیس برس اسی جدوجہد میں گزرے جس نے اسلام اور انسانیت کے حق میں بہتر نتائج پیدا کیے۔

ایک واقعہ ڈیرہ غازی خاں سے چالیس میل دور حاجی پورہ نامی گاؤں میں ایک بزرگ کی خانقاہ پر عرس کے دنوں لوگ بُرے افعال کے مرتکب ہوتے تھے۔ اتفاقاً شاہ جی کا گزر ڈیرہ غازی خاں سے ہوا تو آپ نے مذکورہ گاؤں میں جانے کا فیصلہ کیا۔ اس ارادے کی اطلاع جب ضلع کے انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر ایل، اے، اگل کو ہوئی تو اس نے شاہ جی پر پابندی عائد کر دی کہ وہ حاجی پورہ نہیں جا سکتے۔ شاہ جی نے ڈپٹی کمشنر کا یہ حکم

مان لیا لیکن شہر میں اپنی تقریر کی منادی کرادی اور رات جلسے میں ڈپٹی کمشنر بھی معہ اپنی بیگم کے شاہ جی کی تقریر سننے آیا۔ شاہ جی کو اس کا پتہ چل گیا۔ دورانِ تقریر ڈپٹی کمشنر کو خطاب کرتے ہوئے کہا،

"مسٹر ڈپٹی کمشنر! گو آپ نے مجھے حاجی پورہ جانے سے روک دیا۔ اگر میں وہاں جاتا تو لوگوں کو بھنگ، چرس اور اسی قسم کی دوسری منشیات سے منع کرتا کہ بزرگوں کے مزارات فاتحہ خوانی کے لیے ہوتے ہیں، نہ کہ اس قسم کی بری چیزوں کے لیے۔ خیر اب میں تمہیں اسلام سمجھاتا ہوں۔ اگر تم مع اپنی بیوی کے مسلمان نہ ہو جاؤ تو میرا نام بخاری نہیں"

یہ سن کر ڈپٹی کمشنر فوراً جلسہ گاہ سے چلا گیا۔

ہتھکڑی

۱۹۴۴ء میں شاہ جی ڈیرہ غازی خاں گئے تو حلقہ احباب سے پوچھا کہ یہاں مستری دوست محمد لوہار کون ہیں! میں انہیں ملنا چاہتا ہوں، دوستوں نے وجہ پوچھی تو کہا "ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہتھکڑی نے مجھے ہمیشہ آرام پہنچایا اور وہ میرے ہاتھ میں پوری اترتی ہے۔ جنوب مغربی پنجاب پولیس کے لیے ہمیشہ مستری دوست محمد نے ہتھکڑیاں مہیا کیں اور ہر ہتھکڑی پر انگریزی کے حروف ایم۔ڈی۔ایم کندہ ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کر شاہ جی نے انہیں ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ بڑی مشکل سے مستری صاحب کو تلاش کیا گیا۔ شاہ جی ان سے ملے تو وہ بہت خوش ہوئے اور شاہ جی ہتھکڑی کے موضوع پر ان سے گھنٹوں گفتگو کرتے رہے۔

ہتھکڑی کے لیے کس قسم کا لوہا استعمال ہوتا ہے؟ اس کے سانچے کیسے تیار کیے جاتے ہیں؟ اس پر کوئی سرکاری پابندی ہے یا نہیں؟ بعض مجرم پولیس کی موجودگی میں ہتھکڑی اتار کر فرار ہو جاتے ہیں، یہ کیسے؟

ان سوالات میں شاہ جی نے اس قسم کا مزاح پیدا کیا کہ تمام محفل کشتِ زعفران بنی رہی

ملتان کا محرّم

حادثہ کربلا انسانیت کے دامن پر اس قدر عظیم داغ ہے کہ دریائے فرات، دجلہ اور نیل مل کر بھی اس داغ کو دھونا چاہیں تو اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے۔ اسلام نے جو اصول وضع کیے تھے خانوادۂ نبوّت نے اپنے خون سے ان اصولوں کی پالنا کی اور قیامت تک کے لیے ضابطہ حیات میں ایسا سنگ میل نصب کیا کہ آنے والا ہر مسافر اسی پگڈنڈی پر گامزن رہ کر منزلِ حیات کا نشان پا سکتا ہے۔

صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان نے اس جانکاہ حادثہ کو شدید رنج و غم سے محسوس کیا لیکن دو قسم کے عوام نے واقعہ کربلا کو بظاہر زیادہ محسوس کیا۔ اول وہ جنہیں احکامِ شریعت سے ناآشنائی رہی اور اس طرح سے وہ نمائشی جذبات کا مظاہرہ کرنے میں زیادہ کامیاب ہوئے، دوسرے وہ جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کی قربانی کو بطور پیشہ کے اپنایا۔ محرم الحرام کے دنوں میں تعزیہ داری میں جو لوگ نالہ و شیون کے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے افراد بھی شامل ہوتے ہیں جن کے پیش نظر مندرجہ بالا مقاصد کے سوا کوئی دوسرا اصول کارفرما نہیں ہوتا۔

سال ۱۹۲۹ء کی آخری ششماہی میں جب شاہ جی ملتان گئے تو محرم کی رسم تعزیہ داری کو دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ تیرہ روز تک شہر کے مختلف محلوں میں اس رسم کے خلاف تقریریں کیں۔ جس کی بناء پر مخصوص عقائد رکھنے والے لوگ اس قدر مشتعل ہوئے کہ شاہ جی کے خلاف شہر میں باقاعدہ محاذ قائم کر لیا گیا اور اس قدر اشتعال پھیلایا کہ آخری دن جب "عام خاص باغ" میں جلسے کا اعلان ہوا تو شہر کے خان بہادر آنریری مجسٹریٹ اور سرکاری قسم کے دوسرے لوگوں نے انگریز ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ اگر آج عطاء اللہ شاہ نے ملتان میں تقریر کی تو وہ قتل ہو جائے گا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے خان بہادر سید حسن بخش گردیزی آنریری مجسٹریٹ سے کہا۔

"اگر تمہارے اس اشارے کے بعد عطاء اللہ شاہ قتل ہو گیا تو میں تمہیں بطورِ

مجرم کے گرفتار کروں گا۔

ملتان کی فضا شیعہ سنی منافرت سے گدلی ہو چکی تھی اور واقعی اس دن یہ خوف تھا کہ شاہ جی قتل کر دیے جائیں گے۔ جماعتی دوستوں نے بھی شاہ جی کی خدمت میں درخواست کی کہ آج شہر میں آپ کے خلاف حالات اس قدر زہریلے کر دیے گئے ہیں کہ آپ کی جان خطرے میں ہے، لہٰذا آپ اگر آج جلسہ میں کوئی ایسی بات نہ کہیں تو بہتر ہے۔ اس پر شاہ جی نے کہا:۔

"میرا جواب وہی ہے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زکوٰۃ کے معاملہ میں حضرت عمر فاروقؓ کو دیا تھا۔ اگر تم سب ڈرتے ہو تو میں آج اکیلا جلسے میں جاؤں گا اور وہی بات کہوں گا، جو میرا ضمیر کہے گا۔"

ملتان کی عوامی تاریخ میں اس قدر اجتماع دوبارہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ پولیس جلسہ کے چاروں طرف ہر طرح کے کیل کانٹوں سے لیس کھڑی ہے۔ تمام فرقے اپنی اپنی حفاظت کے لیے تیار ہیں۔ دلوں میں جذبات، آنکھوں میں خون، سینوں میں انتقام کے شعلے موجزن ہیں کہ شاہ جی اپنے حلقہ احباب کی معیت میں جلسہ گاہ پہنچے۔

دن کی روشنی آج پھر ایک سید کے ایمان کا امتحان لینا چاہتی ہے۔ شاہ جی نے اسٹیج پر آتے ہی کلام پاک کی تلاوت شروع کی۔ تقریباً پون گھنٹہ قرأت کے بعد داستانِ کربلا اس انداز سے بیان کی کہ سارا مجمع آہ و فغاں کرنے لگا۔ جیسے جیسے دھوپ کی تمازت بڑھتی جاتی، شاہ جی کا زورِ بیان نکھرتا جا رہا تھا۔ دورانِ تقریر آپ نے کہا:۔

"ان پاک شخصیتوں کے دن ضرور مناؤ! جو قومیں اپنے آباؤ اجداد کے نشان چھوڑ دیتی ہیں، ان کی تاریخ بے نشان ہو کر مٹ جاتی ہے۔"

شیعہ حضرات سے خطاب کرتے ہوئے کہا،

"کون بدبخت تمہیں اپنے عقیدے سے منع کرتا ہے لیکن میرے عزیزو! میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ امام حسینؓ، فاطمۃ الزہرہؓ، بی بی زینبؓ اور معصوم سکینہؓ

کے ماتم کے لیے تمہیں یا زاری حورتیں ہی ملتی ہیں؟ اس طاہر خاندان کے پاک
اور صاف لباس پر گندی نالی کے چھینٹے اڑاتے ہو؟ تم کیسے حسینؓ کے نام لیوا ہو
اپنے ہاتھ سینوں پر نہیں اللہ کے آگے پھیلاؤ کہ وہ ہمیں ان پاک روحوں کے
نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے ۔ میں تو تمہیں نیکی کی بات بتا رہا ہوں اور
تم ہو کہ میرے قتل کا سامان کر رہے ہو ۔ اگر واقعی عطا اللہ شاہ قتل کے قابل
ہے تو یہ سینہ حاضر ہے۔"

اس موقع پر شاہ جی نے جذبات سے اپنا گریبان چاک کر لیا۔ بس پھر کیا تھا، سارا مجمع
بے اختیار چیخیں مارنے لگا۔ اور شاہ جی بار بار کہہ رہے تھے:۔

"نکالو اپنے اپنے خنجر! سیّد کا سینہ حاضر ہے۔ تم نے پہلے بھی ایک سیّد
مسافر کو قتل کیا تھا، آج پھر اس سُنّت کو تازہ کرو! میں سیّد بھی ہوں اور مسافر بھی۔"

شاہ جی اس وقت قرآن کریم کی بار بار تلاوت کر رہے تھے ۔ آخر جب سارا جلسہ
اپنے آنسو ختم کر چکا تو آپ نے جلسہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

جلسہ کے اختتام پر خان بہادر چودھری ناظر خاں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ملتان
اور حاجی رانجھا خاں مال آفیسر ملتان نے آگے بڑھ کر شاہ جی کے گھٹنوں کو چھوا اور کہا:۔

"آج شہر کا امن آپ کے ایک ایک بول کا محتاج تھا۔ اللہ آپ کو
جزائے خیر دے کہ آپ نے امن بحال رکھنے میں ہماری امداد کی۔"

اس جلسہ کے بعد کئی سال تک تعزیہ داری کے جلوس میں اس بازار کا داخلہ بند رہا۔

شاردا بل عیسائی قومیں عالم اسلام کے خلاف ابتدائے آفرینش سے عجیب و غریب
حربے استعمال کرتی آئی ہیں ۔ کہیں اپنی اکثریت کے سہارے اور کہیں
حکمرانی کے زور پر ۔ لیکن اسلام باوجود مظلوم ہونے کے صرف اپنی حقانیت کی بنا پر
پروان چڑھتا رہا۔

متحدہ ہندوستان میں عیسائی حکمرانوں نے نئے نئے حیلے بہانوں سے اسلام اور مسلمانوں کو دوسری اقوام کی نظر میں اپنی غلامی کے زور پر رسوا کرنے میں ایسی حرکتیں کیں کہ جن سے خطرہ ہونے لگا کہ مسلمان اپنی قدریں مٹا کر کفر کی آغوش میں امان ڈھونڈنے جا رہے ہیں، لیکن دیوبند سے فارغ التحصیل رہنماؤں نے فرنگی حکمرانوں کی قلبی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح سامنے آکر حکمران جماعت کے تمام ہتھیار بیکار کر دیئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تو اکثر قانون ہندوستان میں ایسے وضع کیے گئے جن کی براہ راست زد اسلام پر پڑتی رہی۔ لیکن غیر ملکی نظامِ حکومت ان سے بیگانہ رہ کر اپنا کام کرتا رہا۔

۲۳۔ستمبر ۱۹۲۹ء کو دہلی سنٹرل اسمبلی کے ہندو ممبر مسٹر ہربلاس شاردا نے ایک مسودہ قانون پیش کیا جو آگے چل کر شاردا بل اور شاردا ایکٹ کے نام سے مشہور ہوا۔

شاردا بل بظاہر ہندو سوسائٹی کی اصلاح سے متعلق تھا لیکن اس کے پس منظر میں ایک ایسا اوچھا وار تھا کہ جس کی ضرب سے احکامِ شریعت براہِ راست متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ بل پر بحث سے قبل یہ سوال سامنے آیا کہ یہ بل صرف ہندو عوام تک رہے گا یا ہندوستان کے تمام مذاہب اس سے متاثر ہوں گے۔ اور اکثر مسلمان ارکان اسمبلی نے بغیر علماء کے مشورہ کے اس بل کی تائید کر دی۔ ۲۸۔ستمبر ۱۹۲۹ء کو یہ بل پاس کر دیا گیا نیز یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے اس بل پر عملدرآمد ہونا منظور کیا گیا۔

جمعیۃ العلمائے ہند نے قرآنِ کریم کے واضح ارشاد کی روشنی میں شاردا بل کو مداخلت فی الدین قرار دے کر اس کے نفاذ سے پیشتر اس قانون کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ انبالہ سے پرلی طرف مولانا احمد سعید اور پنجاب سے سرحد تک کے اضلاع شاہ جی کے سپرد کیے گئے۔

۲۸۔ستمبر ۱۹۲۹ء سے یکم اپریل ۱۹۳۰ء تک دونوں رہنماؤں نے اپنی اپنی ذمہ داریوں

کے پیشِ نظر ہزاروں نابالغ بچوں کے نکاح پڑھا کر اور عوام کو اس کی ترغیب دے کر انگریز کے اس قانون کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ آج بھی پنجاب اور سرحد میں سینکڑوں گھرانے ایسے ملیں گے جنہیں شاہ جی نے اس زمانے میں آباد کیا تھا۔

شاردا ایکٹ جس کا محرک بظاہر غیر مسلم تھا۔ جس کی رو سے اٹھارہ سال سے کم عمر لڑکی اور اکیس سال سے کم عمر لڑکے کی شادی قانوناً جرم قرار دے دی گئی تھی، عیسائی حکومت کی قانونی قوت نے اسے ایسی زندگی بخشی کہ اگر اس پر عمل درآمد ہوتا تو اسلام کے اصول بری طرح مجروح ہوتے۔

سرگودھا، میانوالی، گجرات، جہلم ایسے اضلاع ہیں کہ انگریزی عملداری میں یہ علاقے فوجی مرکز سمجھے جاتے تھے۔ ان پر کسی انگریزی قانون کا عاجلانہ اطلاق مشکل نہیں تھا، مگر شاہ جی نے شب و روز کی تقریروں سے ان علاقوں میں شاردا ایکٹ کو ناکارہ بنا دیا۔ ہر فرد نے شاہ جی کی آواز پر لبیک کہا اور شاردا ایکٹ کی دھجیاں بکھیر دیں۔

مجلسِ احرار کی صدارت

نہرو رپورٹ کی ناکامی کے باعث ہندوستان کے سیاسی افق پر واقعات کے نئے بادل اُمڈ آئے۔ ہواؤں کا رخ اس انداز سے تبدیل ہوا کہ سارا ہندوستان تلخی محسوس کرنے لگا۔ سائمن کمیشن کی ناکام واپسی کے بعد گاندھی جی نے انگریزوں کو چیلنج کیا کہ اگر ۱۹۲۹ء کے آخر تک نہرو رپورٹ کے فارمولا کو منظور نہ کیا گیا۔ اور اسے سرکاری حیثیت نہ دی گئی تو میں عدم تشدد کی لڑائی شروع کر دوں گا۔ برطانوی حکومت گاندھی جی کی اس تجویز کو ہواؤں میں اڑا کر مستقبل کا انتظار کرنے لگی۔ انگریزی حکومت کی اس بے اعتنائی کے سبب دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں دریائے راوی کے کنارے آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر گاندھی جی نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

مسلمان رہنماؤں نے گاندھی جی اور کانگریس کی اس حرکت کو سکھوں کی بے جا حمایت اور مسلمانوں سے ناانصافی قرار دے کر اپنی علیحدہ تنظیم کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد

کی تجویز پر نیشلسٹ مسلمانوں نے آل انڈیا کانگریس کے پنڈال میں چودھری افضل حق کی صدارت میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ جس میں شاہ جی کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، شیخ حسام الدین، خواجہ عبدالرحمان غازی، مولانا مظہر علی اظہر اور دوسرے مسلمان رہنما شامل ہوئے۔ اس اجلاس میں مجلس احرار کی بنیاد رکھی گئی اور شاہ جی کو پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

نمکین شتیہ گرہ مجلس احرار کی بنیاد کے ساتھ ہی کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس میں مکمل آزادی کی قرار داد منظور کر کے اقوام ہند کو آزادیٔ وطن کیلئے ایثار و قربانی کی نئی دعوت دی۔ مسلمان جس نے سلطان حیدر علی ٹیپو، حضرت شاہ ولی اللہؒ، رانی آف جھانسی اور ۱۸۵۷ء جیسی تحریکات میں فرنگی سامراج کے خلاف جہادِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ کانگریس کی اس دعوت کو بھی قبول کر لیا۔ مجلس احرار کے رہنماؤں نے نئی عمارت کی تعمیر کو عارضی طور پر روک دیا اور سب کے سب کانگریس کے ہم نوا ہو کر آزادی کی نئی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔

۱۹۲۹ء کے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی آخری شعاعوں نے شفق میں ایسا رنگ بھرا کہ ۱۹۳۰ء کا سال غلام ہندوستان کے لیے مصائب و آلام کی بے شمار آزمائشیں اپنے ساتھ لایا۔ شدھی اور سنگھٹن، تحریک شاتم رسولؐ، شاردا ایکٹ ایسی فرقہ وارانہ تحریکات ہنوز ہندوستان میں اپنے کام میں مصروف تھیں۔ شاہ جی ان کے فیصلوں سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ مجلس احرار کی صدارت نے شاہ جی کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ جماعت نے جنگِ آزادی میں کانگریس کے دوش بدوش لڑائی لڑنے کا فیصلہ کر کے شاہ جی کو مزید الجھا دیا۔

غلام غیر ملکی آقاؤں سے آزاد ہونے کے لیے زندگی کا آخری اثاثہ لے کر میدانِ کارزار میں اپنی صفیں درست کرنے لگے۔ کفن بردوش مجاہد شہادت کی لَے پر موت کے گیت چھیڑ کر شہادت گاہِ الفت کی طرف رواں دواں ہونے۔ جیل خانے، ہتھکڑیاں، پھانسی کے

تختے، مشین گنیں، بید زنی، لاٹھی چارج، پولیس، فوج، انگریزی سامراج اپنے ظلم و جور کی یہ ساری پونجی جمع کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ وہی دن تھے جب لاہور میں سردار بھگت سنگھ اور مسٹر بی۔ کے۔ دت کو موت اور عبور دریائے شور کی سزائیں سنائی جا چکی تھیں۔ اور پورا ملک انگریزی حکومت کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔ مہاتما گاندھی نے ۱۲۔ مارچ ۱۹۳۰ء کو ڈانڈی ضلع گجرات (کاٹھیاواڑ) میں نمک بنا کر انگریزی قانون کی خلاف ورزی کرنے کا اعلان کیا اور بہتر آدمیوں کا جتھہ لے کر اپنے مرکز سے روانہ ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ اس گرفتاری کے ساتھ ہی سارے ہندوستان میں نمک ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہو گئی۔

امیرِ شریعت کا اعزاز

پیشتر ازیں تحریر کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی ابتری نے ملک کا امن و سکون تہہ و بالا کر دیا تھا اور یہ خانہ ویرانی اسلام کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں تھی۔ ہندو کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے لیے شہادت کی موت تلاش کریں تاکہ ہندوستان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو محفوظ رہ سکے۔ شدھی و سنگٹھن شاردا ایکٹ، تحریک شاتمِ رسول کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے کمزور اور قلیل تعداد مسلمانوں کو اس قدر ہراساں کر دیا تھا کہ علمائے کرام کی اپنی ذمہ داریاں بھی مخدوش نظر آنے لگی تھیں خطیب شہر کی اذان بے اثر ہو رہی تھی۔ صحن حرم اور مسجد کے مینار اپنی رونق کی تلاش میں سرگرداں تھے کہ مارچ ۱۹۳۰ء کے آخری دنوں لاہور میں انجمن خدّام الدین کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت علامہ انور شاہ صاحب کاشمیری نے فرمائی۔ وقت اور حالات کی موجودگی میں علمائے ہندوستان کا یہ تاریخی اجتماع تھا۔ دوسرے علماء کے ساتھ شاہ جی بھی اس جلسے میں شریک ہوئے۔ ہزاروں کا اجتماع تھا۔ صدارتی تقریر ہو رہی تھی کہ شاہ جی جلسہ گاہ میں پہنچے۔ حضرت انور شاہ صاحب فرما رہے تھے:۔

"دین کی قدریں بگڑ رہی ہیں۔ کفر چاروں طرف سے یلغار کر چکا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنے لیے ایک امیر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس کے لیے

میں سید عطا اللہ شاہ بخاری کو منتخب کرتا ہوں۔ وہ نیک بھی ہیں اور بہادر بھی
اس وقت تک انہوں نے فتنہ شاتم رسول اور شاردا ایکٹ کے سلسلے میں
جس جرأت اور دلیری سے دین کی خدمات انجام دی ہیں، آئندہ بھی ان سے
ایسی ہی توقع ہے۔

یہ کہہ کر حضرت انور شاہ صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ شاہ جی کی طرف بڑھائے اور شاہ جی نے اپنے دونوں ہاتھ حضرت انور شاہ صاحب کے ہاتھوں میں دے کر فرمایا:۔

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ حضرت نے میرے ہاتھ پر بیعت کی بلکہ حضرت نے مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمالیا ہے"۔

یہ جملے کہہ کر شاہ جی زار و قطار رونے لگے اور ان کا سارا جسم کانپنے لگا۔ اس کے بعد باقی علما جن کی تعداد پانچ صد تھی اس وقت شاہ جی[1] کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا احمد علی لاہوری سر فہرست تھے۔

حصولِ زندگی میں مذہب ایسے جذبات کا مجموعہ ہے جس سے عقل انسانی احاطہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی فکر و تدبر میں ان کا وزن کیا جا سکتا ہے۔ جنونِ شوق ہی البتہ اس کسک کو محسوس کرتا ہے۔ پھر نمرود کی آگ ہو یا دریائے نیل کی موجیں وہ ان تمام خطرات کی دعوت پر لبیک کہتا ہے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۰ء تک فرنگی عملداری میں کفر و ارتداد نے اصول اسلام، داعیٔ اسلام اور مسلمانوں پر وقت کے مختلف موڑوں سے جس طرح بے محابا خشت باری کی حضرت امیر شریعت سینہ سپر ہو کر ان سے ٹکرائے اور بامراد ہوئے۔ حضرت انور شاہ صاحب اور دیگر پانچ صد معتدر علماء کا سید عطا اللہ بخاری کو امیر شریعت کا اعزاز بخشنا انہی خدمات کا صلہ تھا اور ہنوز مستقبل کی کئی امیدیں ان سے وابستہ تھیں۔

---

[1] آئندہ شاہ جی کی بجائے امیر شریعت کا لفظ آئے گا۔

امروہہ میں جمعیۃ علمائے ہند کا اجلاس

مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد ستیہ گرہ کی تحریک میں خاصا ہیجان پیدا ہو گیا اور سول نافرمانی کے ذریعے رضاکار، کارکن، رہنما جیل خانوں میں جا چکے تھے۔ مجلس احرار کے سوا باقی مسلم جماعتیں اور خاص کر جمعیۃ علمائے ہند جو نہرو رپورٹ میں اختلاف کے باعث کانگرس سے الگ ہو چکی تھی ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی آزادئ وطن کی تحریکات میں کانگرس سے اشتراک کے حامی تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانویؒ الگ اپنی رائے رکھتے تھے۔ نہرو رپورٹ سے علیحدگی کے باعث علی برادران نے بھی جمعیۃ العلماً علیحدہ بنالی تھی جسے دوسرے گروہ کی تائید حاصل تھی۔

ہندوستان میں اس کشمکش نے مسلمانوں کو من حیث القوم کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ چنانچہ اول الذکر گروہ نے ۳۔مئی ۱۹۳۰ء کو امروہہ ضلع مرادآباد میں اپنا ایک اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ جمعیۃ علماء کا یہ تاریخی اجتماع تھا جس میں جمعیت کی آئندہ پالیسی پر غور ہونا تھا۔

امیر شریعت پنجاب میں سول نافرمانی کا آغاز کر چکے تھے۔ حکومت ان کے مدمقابل آ چکی تھی اور گرفتاری کی تیاریوں میں تھی کہ مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے جو ان دنوں گرفتار ہو کر لدھیانہ جیل میں تھے، امیر شریعت کو کسی طرح جالندھر سے لدھیانہ بلا بھیجا۔ امیر شریعت لدھیانہ ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ پنڈت من موہن کی موٹر میں لدھیانہ پہنچے اور نصف رات گئے سپرنٹنڈنٹ جیل کے ذریعے ہی مولانا حبیب الرحمٰن سے ملے وہیں فیصلہ ہوا کہ امیر شریعت راتوں رات پنجاب کی حدود سے نکل کر امروہہ پہنچنے کی کوشش کریں تاکہ جمعیت علمائے ہند کو مجبور کیا جا سکے کہ وہ بلا شرط آزادی وطن کی تحریک میں کانگرس سے اشتراک کرے۔ چنانچہ ۲۔مئی کو امیر شریعت امروہہ پہنچ چکے تھے۔

علی برادران کی جمعیۃ العلماً کا اجلاس بھی انہی تاریخوں پر دہلی میں ہو رہا تھا دونوں

عالمِ اسلام کے دشمن فرنگی سے جس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا مگر اسلام کے غروب ہونے کا خطرہ بڑھ رہا ہے ایسی جنگ لڑیں کہ وہ ہندوستان کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر ہم بحیثیت مسلمان انگریز کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو یاد رکھیں اس سے نہ صرف عرب ریاستیں بلکہ تمام بلادِ اسلامیہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائیں گے۔

میں ہندو کو بھی اپنا دوست قرار نہیں دیتا۔ لیکن ان کی دشمنی ساحلِ سمندر تک محدود ہے مگر انگریز تو سمندر پار تک اسلام کا تعاقب کر رہا ہے۔

اگر میں اپنے چھوٹے دشمن (ہندو) کے ساتھ مل کر انگریز ایسے اسلام کے بڑے دشمن کو شکست دے سکوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ سودا کوئی مہنگا نہیں ہوگا۔

علمائے کرام! اگر میرا بس چلے تو میں انگریزوں کو مارنے کے لیے سوروں سے اتحاد کرنے میں بھی گریز نہ کروں۔ کیونکہ اس کی زندگی سے اسلامی تہذیب و تمدّن اور انسانیت کی موت ہو جائے گی اور اس کی موت سے اسلام اور مسلمان زندہ ہو جائیں گے۔ اسلامی ممالک میں اتحاد بڑھے گا۔ مسلمانوں میں رُوح جاگ اٹھے گی۔

جو مسلمان انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر خانہ کعبہ پر گولی چلاتا ہے اور پیرانِ پیر کے روضہ پر حملہ آور ہوتا ہے وہ پھر اپنے مقامات مقدّسہ کی حفاظت کرے گا۔ لٰہذا میری درخواست ہے کہ آپ دین اسلام کے لیے، مسلمانانِ عالم کی آزادی کے لیے کانگرس سے تعاون کریں۔

ہندو اتنا طاقتور نہیں ہے کہ ہم اس سے خائف ہو کر عالمِ اسلام کی امداد کو نظر انداز کر دیں۔ یار لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلمان کو کھا جائے گا۔

حضرات! یہ کس قدر جھوٹ ہے۔ یہ مرغی کی ایک ٹانگ تو کھا نہیں سکتا وہ میرے ایسے مسلمان کو کیسے ہضم کر سکتا ہے۔

ہندو تہذیب یا اس کی دشمنی گنگا سے کاشی تک ہے لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جس کی بنیاد سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے آسمانوں کے آخری جہانوں تک ہے۔ اگر اس بنیادی اور سچے مذہب کی حفاظت چاہتے ہو تو عیسائی حکمرانوں سے ہندوستان کو نجات دلاؤ۔

اپنی تقریر کے دوران امیر شریعت قرآن کریم سے سورۂ بقر کے اکثر حصے تلاوت کرتے رہے۔ آخر تین دن کی مسلسل بحث کے بعد ۶۔ مئی کو جمعیۃ علمائے ہند نے مولانا حفظ الرحمٰن کی قرارداد کو بغیر کسی اختلاف کے منظور کر لیا۔

وارنٹ گرفتاری پنجاب پولیس امیر شریعتؒ کے وارنٹ لے کر امروہہ پہنچی دوسری طرف امروہہ میں امیر شریعت نے جو تقریر کی قانون نے اسے بھی پسند نہ کیا۔ چنانچہ ایک وارنٹ یہاں بھی تیار ہو گیا۔ اور امروہہ کی پولیس آج کسی وقت امیر شریعت کو گرفتار کر لے گی۔ یہ سن کر مقامی کارکنوں نے ۷۔ مئی کو رات کو امیر شریعت کی تقریر کا اعلان کر دیا۔

پولیس اس خیال میں رہی کہ دن کی گرفتاری سے عوام میں ہنگامہ نہ ہو۔ رات جب جلسہ سے فارغ ہو کر قیام گاہ پر آئیں گے گرفتار کر لیں گے۔

جلسے کی ابتدائی تقریر مولانا احمد سعید دہلوی کی تھی لیکن لوگ امیر شریعت کی تقریر کے منتظر تھے۔ پولیس اپنی جگہ مطمئن تھی۔ رات دو بجے مولانا احمد سعید نے اپنی تقریر کے دوران گھڑی دیکھ کر کہا:۔

"ادھر! کافی رات جا چکی ہے اور آپ لوگ سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے انتظار میں ہوں گے۔ چلو پھر سن لینا۔ اب میں جلسہ برخاست کرتا ہوں۔"

اس اعلان کے بعد پولیس امیر شریعت کی تلاش میں نکلی تو معلوم ہوا کہ وہ جلسہ شروع ہوتے ہی امروہہ سے نکل گئے تھے۔ ہتھ آیا ہوا شکار ضائع ہوتے پر شکاری کس قدر شرمندہ ہوتا ہے ـــــ امروہہ کی پولیس اپنے اقدام کی ناکامی پر سخت شرمندہ ہوئی۔

دوسرے دن اطلاع ملی کہ امیر شریعت الہ آباد سوراج بھون میں پنڈت موتی لال نہرو کے ہاں مہمان ہیں۔ پنڈت جی امیر شریعت کی تقریر اور تلاوت قرآن کریم سے متاثر تھے۔ رات الہ آباد میں امیر شریعت کی تقریر ہو رہی تھی کہ پولیس نے چاروں طرف سے جلسے کا محاصرہ کر لیا۔ پولیس کی اس حرکت سے امیر شریعت کی گرفتاری کا شبہ ہوا تو دیکھتی نظروں نے جلسہ گاہ میں جو ایک منٹ پہلے روشنی سے بقعہ نور تھا تاریک اندھیرا دیکھا اور لاتنے میں معلوم ہوا کہ امیر شریعت اپنے میزبان کی کار پر الہ آباد سے جا چکے ہیں حالانکہ وہ سوراج بھون ہی میں مقیم تھے۔ دوسرے روز جب پولیس کو اطمینان ہو چکا کہ امیر شریعت ان کی حدود سے نکل گئے ہیں تب امیر شریعت پنڈت موتی لال نہرو کی ہمراہی میں آگرہ پہنچے۔ جلسے کا اہتمام پیشتر سے ہو چکا تھا۔ پروگرام کے عین مطابق وقت پر امیر شریعت کی کار قلعہ کے میدان میں پہنچی۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں فرش راہ تھے۔ خطبہ مسنونہ کے بعد حسب عادت مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو ایک کونے سے آواز آئی۔

"تم نے اگر حکومت کے خلاف یا کانگرس کے حق میں کوئی بات کہی تو قتل کر دیے جاؤ گے۔"

جیسے ہی امیر شریعت نے اس آواز کی طرف توجہ دی تو شہر کے قصاب ہاتھوں میں چھرے اور کلہاڑیاں اٹھائے ایک کونے میں کثیر تعداد میں کھڑے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے مجمع چیر کر امیر شریعت کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ بلوائیوں کی اس حرکت سے جلسے پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ خود پنڈت موتی لال نہرو پریشان ہوئے پولیس

بطور تماشائی کے سامنے کھڑی یہ کھیل دیکھتی رہی۔ اتنے میں امیر شریعت نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کی اور سورۂ بقر کے دو رکوع پڑھ کر ترجمہ کرنا چاہا لیکن مفسدوں نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ اسی کشمکش میں نصف رات بیت گئی۔ شاہی قلعہ اور تاج محل کی پرشکوہ عمارتیں مسلمان کے انحطاط کی ماندہ قابل غور دیواروں کو گرتے دیکھ کر اور خاموش ہو گئیں۔ جیسے جیسے رات بھیگتی جا رہی تھی جلسے پر نیند کا غلبہ بڑھ رہا تھا۔ مگر امیر شریعت اور ان کے قاتل آمنے سامنے کھڑے تھے

ملک الموت کو ضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں
سر بہ زانو ہے مسیحا کہ مری بات رہے

اس کھینچا تانی میں مرغِ سحر نے اذان دی اور امیر شریعت نے سورۂ یوسف کی تلاوت شروع کر دی۔ رات کی موت پر طلوعِ سحر کا نغمہ الاپتے ہوئے زندگی نے انگڑائی لی۔ آگرہ کے عوام نے رات بھر تماشہ دیکھا کہ قاتل اور مقتول مقتل میں اپنی ذمہ داریوں کے تول تُل رہے ہیں مگر نہ قاتل کے ہاتھ اٹھے اور نہ مقتول کی گردن جھکی۔

کلام اللہ اور امیر شریعت کی زبان، نسیم صبحگاہی، ان سب نے قاتلوں کے عزائم پر نیند کا بوجھ ڈال دیا۔ امیر شریعت نے تقریر شروع کی جو دن کے نو بجے تک جاری رہی۔ گو سامعین کی تعداد میں بدستور کمی آتی گئی، مگر معرکۂ حق و باطل میں امتیاز کرنے والے عشاق بدستور ڈٹے رہے۔ اس دوران مخالفین کو زبان درازی کی جرأت نہ ہوئی تاآنکہ صبح سب کے سب امیر شریعت کے قدموں میں آگرے اور رات بھر کی گستاخیوں کی ہزار بار معذرت چاہی۔

قاتلانہ حملہ

نمک کی ستیہ گرہ کے دنوں حکومت کی طرف سے ہر ضلع کی پولیس کو اختیار تھا کہ جس مقرر کو چاہے گرفتار کر سکتی ہے۔ ہندوستان بھر کے سیاسی کارکن کچھ تو گرفتار ہو چکے تھے اور کچھ روپوش ہو کر تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ کانگرس کی سرگرمیاں خلاف آئین قرار دی جا چکی تھیں لیکن امیر شریعت کی سرگرمیاں گورنمنٹ آف انڈیا کے لیے قابل اعتراض ہی نہیں، ناقابل برداشت حد تک پہنچ چکی تھیں۔ اس وقت تک پنجاب

اور صوبہ یوپی سے امیر شریعت کے خلاف بیس وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے اور انگریزی قانون کے محافظ نشان پائے امیر شریعت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ امروہہ اور آگرہ کی شکست کے بعد حکومت اور حکومت پرست نئے منصوبے باندھنے لگے جس سے وہ بڑھتے ہوئے طوفان کا راستہ روک سکیں۔

صوبہ یوپی سے فارغ ہو کر امیر شریعت بمبئی پہنچے۔ حالات فرنگی قانون سے بغاوت کا علم تھامے کھڑے تھے۔ واقعات کے ہاتھ سامراج کے خلاف جلتی آگ کو اپنے دامن سے ہوا دے رہے تھے۔ ساحل سمندر سے ٹکراتی ہوئی موجوں نے آگے بڑھ کر امیر شریعت کے قدم لیے۔ رات بندر روڈ پر جلسے کا اعلان کر دیا گیا۔ لاکھوں کی آبادی کا شہر بندر روڈ پر اُمڈ آیا۔ آگرہ کی شکست کا انتقام لینے خواجہ تاشان برطانیہ اپنے ارادوں سے مسلح جلسے کی صف اوّل میں جگہ سنبھال چکے تھے۔

قانون اور وقت جب ایک دوسرے سے متصادم ہوں تو دلوں سے بغاوت کا پھوٹ نکلنا اچنبھے کی بات نہیں۔ آزادی ہند کی تحریک میدانوں سے نکل کر پہاڑوں اور سمندروں تک جا پہنچی تھی۔ بغاوت کے الاؤ اس قدر روشن تھے کہ برطانوی راج کا وجود خطرے کے قریب پہنچ چکا تھا! ایسے وقت میں برطانوی باغی کا بمبئی پہنچنا حکومت کے لیے ناپسندیدہ تھا۔ فیکٹریوں کا شہر جہاں چمنیوں کے دھوئیں، سمندر کی وسعتوں کو بادلوں کا فریب دیتے رہیں۔ یہاں کے انسان دولت کے انبار پر کھڑے ہو کر انسانیت کو بہت اونچائی سے دیکھتے ہیں۔ کاخ امراء کی بلند و بالا چوٹیاں آدمی کو دیکھنے میں جہاں ہمیشہ فریب خوردہ ہوں وہاں انگریز کے خلاف بات کرنا اپنے بخت کو بگڑے ہوئے سانچے میں ڈھالنا ہے لیکن امیر شریعت نے بمبئی کے عوام کو خطاب کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ انگریزی سامراج کے خلاف جلتی ہوئی بھٹی میں مزید ایندھن کا اضافہ ہو سکے۔

امیر شریعت نے خطبہ مسنونہ کے بعد تقریر شروع کی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"غلامی سب سے بڑا گناہ ہے۔ اگر اس گناہ سے نکلنا ہے تو اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ ہم انگریزوں کے خلاف پرامن لڑائی میں شریک ہو جائیں"۔

یہ فقرہ ابھی نامکمل تھا کہ مجمع سے کسی نے تیز دھار کی چھری امیر شریعت کی طرف زور سے پھینکی، جسے ایک نوجوان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنے سینے پر روک لیا۔ یہ ضرب اس قدر شدید تھی کہ تھوڑی دیر بعد زخمی نوجوان کا انتقال ہو گیا۔ مقتول نور خاں نامی کوہاٹ کا رہنے والا (اکیس سالہ نوجوان) تھا۔ نور خاں کی موت سے امیر شریعت کی جان بچی۔ لیکن نور خاں کے خون سے غیر ملکی سامراج کا وقار آخر کو مٹ کر رہا۔ گو قاتل گرفتار نہ ہو سکا مگر تحقیق پر معلوم ہوا کہ چھری زہر آلود تھی۔ اس افراتفری میں امیر شریعت پولیس کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

گرفتاری

آگرہ اور بمبئی کے قاتلانہ حملوں کے بعد امیر شریعت نے اس ضلع کو چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔ اور یہاں سے ایک ماہ کے پیدل اور سنگلاخ راستوں پر خاموشی سے سفر کرنے کے بعد کلکتہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہندوستان بھر میں ہر ضلع سے گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ حالات کے غیر مطمئن ہونے کے باعث امیر شریعت کے لیے ایک جگہ قیام غیر ممکن تھا۔ کلکتہ کے عوام جو ۱۹۰۵ء (تقسیم بنگال) سے انگریزوں کے خلاف دہشت پسندی اختیار کر چکے تھے، کانگرس کی تحریک سے بھی تعاون کر رہے تھے۔ امیر شریعت کے اس صوبہ میں دورہ سے سیاسی حالات کو اور جلا مل گئی۔ آپ نے دیہات، قصبات اور شہری عوام کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ آخر ۲۰ اگست ۱۹۲۰ء کو دیناج پور (بنگال) میں دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ گو وارنٹ تو بہت تھے لیکن مقدمہ صرف ضلع علی پور کی ایک تقریر پر چلا۔ چونکہ کانگرس نے انگریزی عدالتوں سے عدم تعاون کا حکم دے رکھا تھا لہٰذا امیر شریعت عدالت کی تمام کارروائی سے الگ رہے۔ آخر ۲ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو چھ ماہ قید کی با مشقت سزا ہوئی۔

علی پور جیل سے آپ کو ڈم ڈم جیل میں تبدیل کر دیا۔ جہاں تمام ایام اسیری گزارے۔

باب سوم ——— ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء

ڈم ڈم جیل جیل خانہ اس متحرک دنیا میں ہونے کے باوجود اپنے آئین کی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ہر گوشے میں ظلم و انصاف کے درمیان ٹکراؤ رہتا ہے۔ اجنبی حکمران جیلوں میں سیاسی قیدیوں سے بعض ایسے ضابطے منواتے رہے جسے نہ ضمیر پسند کرتا تھا اور نہ ہی دماغ اس پر رضامند ہوتا تھا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو امیر شریعت جب ڈم ڈم جیل میں داخل ہوئے تو سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر سیمسن (جو بعد میں بنگالی دہشت پسندوں کے ہاتھوں مارا گیا) نے امیر شریعت کو حکم دیا کہ وہ اپنے سر سے گاندھی کیپ اتار دیں۔ یورپین سپرنٹنڈنٹ کے مطالبہ پر امیر شریعت نے کہا:۔

"اوّل تو یہ گاندھی کیپ نہیں، اجمل کیپ ہے۔ اور یوپی کے اکثر شرفا اسے پہنتے ہیں۔ دوسرے میں اے کلاس کا قیدی ہوں۔ مجھے اپنا ہر طرح کا ذاتی لباس پہننے کا قانوناً حق ہے۔"

سپرنٹنڈنٹ نے جواب میں کہا:۔

"علماء کی رائے ہے کہ یہ گاندھی کیپ ہے لہٰذا آپ اسے جیل کے اندر نہیں لے جا سکتے۔"

امیر شریعت:۔ "میں خود عالم ہوں اور میں جانتا ہوں کہ دیوبند کے علماء عام طور پر یہی کیپ پہنتے ہیں لہٰذا میں اسے نہیں اتاروں گا۔"

یہ بحث تمام دن رہی۔ آخر امیر شریعت کامیاب ہوئے۔ لیکن ابتداء کی

لڑائی سزا کے اختتام تک وجہ نزاع بنی رہی۔ جیل مینول نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو لامحدود اختیار سونپ رکھے ہیں۔ تڑپتے ہوئے جانور کی طرح قیدی کا تماشہ تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بسمل کے زخموں پر مرہم کا رواج اس مقتل میں نہیں۔ امیر شریعت گو بڑی حیثیت کے قیدی تھے لیکن تھے تو قیدی۔ زنجیر سونے کی اور خوراک میں یاقوت استعمال ہوں تب بھی قفس قفس ہے، قفس آشیاں نہیں ہوتا۔

رستم زماں سے ملاقات

دنیا کے شہ زور اور فن پہلوانی میں اپنے وقت کے رستم زماں غلام حسین عرف گاما پہلوان نون والے کے آباؤ اجداد آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر مہاراجہ گلاب سنگھ والئ کشمیر کے تشدد کے باعث کشمیر چھوڑ کر امرتسر آباد ہو چکے تھے۔ ان کے والد عزیز بخش پہلوان سیتاپور نامی ریاست کے سرکاری پہلوان تھے۔ اور یہیں ان کی شادی ریاست کے نامی گرامی نون پہلوان کی لڑکی سے ہوئی جس کے بطن سے غلام حسین نے جنم لیا۔ والد کی موت کے بعد غلام حسین کی پرورش ان کے نانا نون پہلوان کے سپرد ہوئی۔ چونکہ ابتدائی زندگی نون پہلوان کی گود میں پروان چڑھی تھی لہٰذا ساری زندگی گاماں پہلوان نون والے کہلواتے رہے۔

نسلی امتیاز کی آگ ایسے دلوں میں بھی روشن ہوتی ہے، جن کے نزدیک یہ امتیاز گناہ کی آخری منزل قرار دی گئی ہے۔ امیر شریعت اور رستم زماں گاماں پہلوان کے نزدیک بظاہر کوئی ڈانڈا نہیں ملتا لیکن ڈوگرہ شاہی کے ستائے ہوئے کشمیری خاندان جب پنجاب آکر آباد ہوئے تو مہاجروں کا یہ ٹولہ ایک ایسی برادری اور خاندانی عصبیت اپنے ساتھ لایا کہ مقامی باشندوں کے رسم و رواج انہیں اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ امیر شریعت کشمیری، رستم زماں کشمیری، دونوں امرتسر میں مقیم۔ اس کے علاوہ امیر شریعت کی یہ ہابی (HOBBY) تھی کہ چڑیا گھر یا سرکس میں شیر کو اور اکھاڑوں میں پہلوانوں کو دیکھنا بہت پسند کرتے۔ ان وجوہ کی بنا پر امیر شریعت اور رستم زماں کے درمیان کئی رشتے مشترک تھے۔ چنانچہ جب کبھی فرصت ہوتی امیر شریعت

رستم زمان سے ملنے جاتے اور اکثر رستم زمان بھی لاہور یا امرتسر میں انہیں ملنے آتے۔

اِن دنوں رستم زمان بنگال کے دورے پر تھے کہ انہیں امیر شریعت کے ڈم ڈم جیل میں قید ہونے کی اطلاع ملی۔ ملاقات کا قصد لے کر پہلوان جیل پہنچے تو امیر شریعت اور سپرنٹنڈنٹ کے درمیان چپقلش آڑے آئی۔ امیر شریعت کی خواہش تھی کہ پہلوان اندر آکر ملاقات کریں اس میں ان کا احترام تھا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ کا تقاضا تھا کہ امیر شریعت عام قیدیوں کی طرح جنگلے میں ملاقات کریں۔ اس میں امیر شریعت کی توہین تھی کہ وہ اے کلاس کے شاہی قیدی تھے۔ سارا دن اسی کھینچا تانی میں گزر گیا۔ آخر سپرنٹنڈنٹ کو ہار ماننی پڑی اور رستم زمان نے جیل کے اندر امیر شریعت سے ملاقات کی۔ اس موقع پر بنگالی قیدیوں نے خواہش کی کہ پہلوان کپڑے اتار کر اپنے بدن کی نمائش کریں۔ قیدیوں کے تقاضے پر دونوں مسکرائے اور رستم زمان نے لنگوٹا کر کے اپنے جسم کی نمائش کی تو بنگالی قیدیوں نے بے اختیار کہا ——— "ہے مانس"! (ارے یہ انسان)

امیر شریعت نے ایام اسیری ضائع نہیں کیے بلکہ سوشل کمار نامی بنگالی قیدی سے آپ نے انگریزی پڑھنی شروع کی اور سوشل کمار امیر شریعت سے قرآن کریم پڑھتا رہا۔ متبادل تعلیم کی دو نشستیں ہوتیں۔ صبح سوشل کمار قرآن کریم پڑھتا تھا اور شام کو امیر شریعت انگریزی پڑھتے۔ وقت اسی طرح گزرتا گیا۔

رہائی

آخر جنوری ۱۹۳۱ء میں "گاندھی اروِن پیکٹ" کے تحت نمکین ستیہ گرہ کی لڑائی بند کر دی گئی۔ تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے۔ امیر شریعت بھی اسی موقع پر رہا ہوئے۔

بہادر بہر حال بزدل نہیں ہوتا۔ امیر شریعت کے چچا سید معیم شاہ پولیس آفیسر تھے اور ان دنوں کلکتہ میں تعینات تھے۔ [illegible]

پناہ دینے میں کسی قسم کی عار محسوس نہ کی۔ قانون اور فرائض کے درمیان دل و دماغ متصادم رہے لیکن خاندانی شرافت نے مہمان بھتیجے کے لیے پیشانی کو شکن آلود نہیں ہونے دیا۔

مجلس احرار کی تشکیل نو

۱۱۔جولائی ۱۹۳۱ء کو اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں احرار کانفرنس کا پہلا اجلاس مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں امیر شریعت چودھری افضل حق، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، مولانا ظفر علی خاں شیخ حسام الدین، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر اور دوسرے مسلمان رہنما شامل ہوئے۔ اس اجلاس کی آخری قرارداد میں جداگانہ انتخاب کی پر زور حمایت کی گئی جس سے کانگریس اور ہندو پریس خصوصاً حواس باختہ ہو گئے۔ اجلاس کے اختتام پر پنجاب بھر میں احرار کے دفاتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ کام حضرت امیر شریعت کے سپرد ہوا اور آپ اپنے رفقا کو لے کر اس پروگرام کو سرانجام دینے کے لیے پنجاب کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔

گاندھی جی سے ملاقات

اسی سفر کے دوران پنجاب کی حدود سے نکل کر جب امیر شریعت دہلی اور یوپی کے اضلاع میں پہنچے تو گاندھی جی کی لندن روانگی کا پتہ چلا۔

گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن روانہ ہونے والے تھے۔ احرار رہنماؤں کی رائے تھی کہ انگریز کی میز پر بیٹھ کر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ غلام ملک کا لیڈر نہیں بلکہ غیر ملکی حکومت کا اقتدار ہی کر سکتا ہے۔

۲۔اگست ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی جب بمبئی پہنچے تو امیر شریعت مولانا حبیب الرحمٰن کے ساتھ انہیں ملنے کے لیے بمبئی پہنچ گئے۔ آپ نے گاندھی جی کو گول میز کانفرنس میں شمولیت سے منع کیا۔ گاندھی جی نے احرار رہنماؤں کی رائے کو وزن تو دیا لیکن لندن جانے کا ارادہ ترک نہ کیا۔

میکلیگن کالج کا حادثہ

ستمبر ۱۹۳۱ء کے آخر کا واقعہ ہے کہ میکلیگن کالج لاہور کے انگریز پرنسپل مسٹر ڈیکیر نے مسلمان طلبا کی دل آزاری کرتے ہوئے

کلاس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر ایسے رکیک حملے کیے جس سے مسلمان طلباء آپے سے باہر ہو گئے اور کالج میں سٹرائیک کر دی۔ محمڈن ہال بیرون موچی دروازہ میں طلباء نے مرکزی کیمپ بنا لیا اور پرنسپل کے خلاف باقاعدہ ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں طلباء کا وفد شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی قیامگاہ پر پہنچا۔ واقعات سن کر ڈاکٹر صاحب نے انہیں احرار رہنماؤں سے ملنے کا مشورہ دیا۔

بمبئی سے واپسی پر دفتر مجلس احرار میں امیر شریعت گاندھی جی سے ملاقات کی رپورٹ اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کر رہے تھے کہ طلبا کا وفد انہیں ملنے کے لیے آن پہنچا۔ حالات اور واقعات سے تحریک کے زیادہ پھیلنے کا احتمال ہوا۔ اسی رات موچی دروازہ کے باغ میں امیر شریعت کی تقریر کا اعلان کر دیا گیا۔ لاکھوں کا مجمع تھا۔ حکومت پنجاب انگریز پرنسپل کی پشت پناہ تھی۔ رات دس بجے امیر شریعت نے تقریر شروع کی اور دو بجے رات تمام مجمع کو ساتھ لے کر راتوں رات میکلیگن کالج کے دروازے پر پہنچ کر ڈیرہ ڈال دیا۔ صبح ہونے تک سارا لاہور میکلیگن کالج کے دروازے پر تھا۔ پولیس کے انتظامات کے باوجود حالات ہر آن بگڑتے جا رہے تھے۔ لیکن امیر شریعت مع اپنے رفقاء مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی عوام کو ہر قسم کی قانون شکنی سے روکتے رہے۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں تو مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا احمد علی گرفتار کر لیے گئے۔ دن بھر کی ہنگامہ آرائی نے شام ہونے تک جھگڑے کو اس قدر مختصر کر دیا کہ پرنسپل نے طلباء سے معافی مانگ لی اور کالج سے خارج شدہ طلبا دوبارہ داخل کر لیے گئے۔ گرفتار ہونے والے رات ہونے تک رہا کر دیے گئے۔ اس طرح حضرت امیر شریعت اور جماعت کی ایک دن کی ہمت نے انگریز پرنسپل کو پچھاڑ دیا۔

تحریکِ کشمیر تحریکِ کشمیر میں مجلس احرار کی شرکت کا سبب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس تحریک کا مختصر پس منظر سمجھ لیا جائے۔

مہاراجہ ہری سنگھ والیٔ کشمیر نے ریاستی نظم و نسق سنبھالتے ہی غریب عوام اور کسانوں پر ٹیکسوں کی بھرمار کر دی۔ مظلوم طبقہ کی کمائی کی ساری پونجی مالیانہ اور آبیانہ کی نظر ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ کشمیر کے غریب عوام موسم سرما میں کشمیر سے نکل کر پنجاب کے میدانی علاقوں میں محنت مزدوری کے لیے پھیل جایا کرتے تھے۔ ان حالات میں عوام نے اپنے جائز حقوق منوانے کے لیے باقاعدہ تحریک کا آغاز کیا۔ انہی دنوں ریاست جموں میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس سے ہندو حکمران اور مسلمان رعایا کے تعلقات خاص طور پر الجھ گئے اور آخر کار یہ تحریک ریاست سے باہر تک پھیل گئی۔

حادثہ یہ تھا کہ جموں میں ریاستی پولیس کا ایک مسلمان سپاہی اپنی بیرک میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا کہ بغیر کسی نزاع کے ایک ہندو سنیاسی نے سپاہی کے ہاتھ سے قرآن کریم چھین کر زمین پر دے مارا۔ کتاب اللہ کی توہین نے تمام نظم و نسق کو پریشان کر دیا۔

عوام، کسان اور خصوصاً مسلمان حکومت کشمیر کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ شیخ عبداللہ کشمیری عوام میں لیڈر کی حیثیت سے روشناس کرائے گئے۔ ان کی تقریروں نے کشمیری عوام کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا کر مہاراجہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس تصادم میں حکومت کی طرف سے نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلیں اور خون بے گناہ سے دریائے جہلم کی بپھری ہوئی موجیں کناروں سے ٹکرانے لگیں۔

ایسے حالات نے پنجاب کے مسلمان کو بھی چونکا دیا اور پریس نے حالات کو بیدار کرنے میں خوب معاونت کی۔ انہی دنوں سر فضل حسین نے شملہ میں چند رجعت پسند مسلمانوں کے تعاون سے کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی جس کے صدر قادیان کے مرزا بشیر الدین محمود اور سیکرٹری عبدالرحمان درد (مرزائی) کو نامزد کیا۔ میاں صاحب اس کمیٹی کے نگران مقرر ہوئے۔

کشمیر کمیٹی کی تشکیل کے ساتھ ہی مرزائی خلیفہ نے سرکار پرست مسلمان رہنماؤں کو اس کمیٹی کا رکن نامزد کر دیا۔ چنانچہ علامہ سر محمد اقبال کو بھی اس کمیٹی میں شامل کر لیا گیا

احرار رہنماؤں کو جب اس ڈرامے کا علم ہوا تو وہ علامہ اقبالؒ سے ملے۔ انہیں حالات سے آگاہ کیا کہ آپ کی وجہ سے نہ صرف کشمیر کا تیئیس لاکھ مسلمان مرزائی ہو جائے گا۔ بلکہ بیرونی ممالک کے مسلمان بھی اس فریب سے متاثر ہوں گے۔ لہٰذا آپ کو کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دینا چاہیے۔ چنانچہ دوسرے ہی روز برکت علی محمڈن ہال میں کشمیر کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس میں تحریک کشمیر کی ساری ذمہ داری مجلس احرار کے سپرد کر دی گئی۔

مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے لاہور کے اجلاس منعقدہ ۱۸۔ اگست میں تحریک کشمیر کو باضابطہ چلانے کا فیصلہ کیا۔ انگریز، ریاستی حکام اور مرزائی حالات سے ہر گھڑی باخبر تھے۔ مجلس احرار کے فیصلے کی روشنی میں آنے والے نئے طوفان کا خوف دلا کر انگریز نے اپنے بااعتماد آدمی ہرکشن کول کو کشمیر کا وزیر اعظم بنا دیا۔

وفد کی روانگی

اوائل اکتوبر ۱۹۳۱ء کو چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر اور خواجہ غلام محمد وفد کی صورت میں کشمیری حکام سے بات چیت کے لیے جموں روانہ ہوئے۔

انگریز اور مرزائی اپنی اپنی اوٹ سے جھانک رہے تھے کہ احرار رہنما سرینگر پہنچے۔ ڈوگرہ شاہی منتظر تھی کہ وفد کے ارکان کو کسی شیشے میں اتار سکیں لیکن راج محل کا تمام جاہ و جلال اپنی امیدوں میں ناکام رہا۔ احرار رہنماؤں کا ضمیر خریدنے والے شاہی سوداگر گداؤں کی طرح ملاقات کو آتے مگر دریائے جہلم کی موجوں پر تیرنے والا شاہی بوٹ ہر روز دیکھتا کہ شاہی فقیروں سے شکست کھا رہی ہے۔ آخر وفد ناکام لوٹ آیا۔

شاہ جی کی گرفتاری

وفد کے کشمیر جانے سے پیشتر حضرت امیر شریعت نے پنجاب کو اپنی تقریروں سے گرما کر میدان کارزار کے لیے تیار کر لیا تھا۔ احرار کے سرخ پوش جیوش کشمیر کی سرحدیں عبور کرنے کے لیے حکم کے منتظر تھے۔ وفد کی ناکام واپسی پر ڈوگرہ شاہی کی سنگینیں اور برطانوی جیل خانے مجاہدین کے انتظار میں تھے۔

مجلس احرار ہنوز سول نافرمانی کے نقشے سوچ رہی تھی کہ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو

بورسٹل جیل

نومبر ۱۹۳۱ء میں مجلس احرار نے کشمیری عوام کی امداد کے لیے ریاست پر یلغار شروع کی۔ جہلم سے میرپور، راولپنڈی سے کوہالہ، سیالکوٹ سے سچیت گڑھ کے راستے احرار رضاکار ریاست کی حدود میں داخل ہوتے۔ انہیں یا تو گرفتار کر لیا جاتا یا وہ ریاستی حکام کے ظلم و جور کا نشانہ بن کر زخمی ہوتے۔ اس طرح تقریباً تین ماہ کی مسلسل لڑائی کے نتیجے میں چالیس ہزار مسلمان جیلوں میں گئے اور بائیس نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ اجنبی حکمران اس دوران تماشائی بنا رہا۔ مگر ڈوگرہ شاہی کا پنجہ ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک طرف انگریزی حکومت اور دوسری طرف جمعیت علمائے ہند کو درمیان میں لا کر احرار سے گفتگو کرنا چاہی اور اس سلسلہ میں احرار ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو پنجاب کی مختلف جیلوں سے لاہور بورسٹل جیل میں منتقل کیا گیا، جن میں حضرت امیر شریعت بھی شامل تھے۔

دہلی سے مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند حکومت کی دعوت پر احرار رہنماؤں سے صلح کی گفتگو کے لیے لاہور پہنچے۔ دونوں حضرات صبح نو بجے جیل تشریف لاتے اور چار بجے شام واپس چلے جاتے۔ آخر ایک ہفتہ کی ناکام گفتگو کے بعد جمعیۃ علماء کے رہنما واپس چلے گئے۔ حالات نے نئی کروٹ لی مہاراجہ کی درخواست پر انگریزی حکومت نے احرار رضاکاروں کی گرفتاریاں شروع کر دیں اور ریاست کے تمام قیدی انگریزی جیلوں میں تبدیل کر دیے گئے۔

حضرت امیر شریعت ان دنوں بورسٹل جیل کی بارڈر لائن میں تھے۔ جیل کا یہ حصہ دس سال سے کم عمر بچوں کے لیے مخصوص ہے، جو معصوم احرار رضاکاروں سے بھرا ہوا تھا۔ امیر شریعت ان بچوں کے درمیان رات دن کھیل کود میں مصروف رہتے تاکہ انہیں گھر اور والدین کی یاد نہ ستائے۔ اس طرح ایشیا کے عظیم خطیب اور ہندوستان کے سیاسی اور مذہبی رہنما نے جس کی ایک للکار ایوان برطانیہ میں زلزلہ پیدا

کر دیتی تھی، جماعت کے بلند مقاصد اور کشمیری عوام کی غلامی کے خلاف قید خانے کو کارِ طفلاں بنا دیا۔

انگریز اور مہاراجہ کے سمجھوتے نے تحریک احرار کا رخ براہ راست برطانیہ کی طرف موڑ دیا۔ اب ہندوستان میں کانگریس اور احرار کی تحریکیں ایک ساتھ چلنے لگیں۔ نیز امیر شریعت اور دوسرے احرار رہنماؤں کو نیو سنٹرل جیل ملتان تبدیل کر دیا گیا۔

کانگریس کی جدید سول نافرمانی کے باعث جمعیۃ علماء اور کانگریس کے رہنما جو پہلے سے ملتان جیل میں موجود تھے، اب ان میں احرار رہنماؤں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ ان مذہبی اور سیاسی شخصیتوں کے باعث جیل کا احاطہ شب و روز علمی مجالس میں منتقل ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء تک یہ رونقیں جاری رہیں۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ میجر فضل الدین جو انگریزی کے علاوہ جرمنی، ترکی اور ایرانی زبان پر قدرت رکھتے تھے بھی ان علمی محفلوں میں برابر کے شریک رہتے اور مستفید ہوتے۔

ایک ماں کا ایثار یوں تو ہزاروں ماؤں نے اپنے بچوں کو تحریک کشمیر کے لیے اپنے ہاتھوں کفن بردوش روانہ کیا لیکن بورسٹل جیل لاہور میں ملاقات کے دوران جب ایک ماں اپنے بچے کو تسلی دے کر اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی، امیر شریعت نے جو ملاقات کے وقت پاس کھڑے تھے نے بچے کی ماں سے کہا

"بچے سے پوچھو اسے کوئی تکلیف تو نہیں"

ماں نے مسکراتے ہوئے آبدیدہ نگاہوں سے کہا:۔

"بیتڈا! میں تے اپنا گودی دا پتر دی تیرے حوالے کرن آئی آں" (شاہ جی! میں تو اپنی گود کا بچہ بھی تمہارے سپرد کرنے آئی ہوں)

جواب میں امیر شریعت نے ماں کے ان جذبات کو اسلام کے لیے زندہ رہنے کی دعا فرمائی۔

جیل سے رہائی اور سکھوں سے ٹکراؤ

دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد گاندھی جی اور دوسرے رجعت پسند ہندو، اور مسلمان رہنماؤں نے برطانوی وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو اپنا ثالث مقرر کر لیا۔ برطانوی وزیر اعظم نے ۱۶۔ اگست ۱۹۳۲ء کو اپنا ثالثی فیصلہ سناتے ہوئے تمام ہندوستان میں مخلوط انتخاب رائج کرنے کی تجویز دی۔ اس ثالثی فیصلہ کی تفصیلات میں پورے ملک میں مخلوط انتخاب، سندھ کی علیحدگی، اچھوتوں کے لیے باحیثیت ایک قوم جداگانہ انتخاب کا حق اور پنجاب و بنگال میں مسلم اکثریت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔

اس ثالثی فیصلہ سے سکھ بے حد برہم ہوئے۔ چنانچہ اکتوبر میں ماسٹر تارا سنگھ نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:۔

"اگر پنجاب میں مسلم راج قائم کرنے کی طرح ڈالی گئی تو ہم خون کی ندیاں بہا دیں گے"

سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے اس قسم کی ہنگامی محفلیں گرم تھیں کہ ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو امیر شریعت ملتان نیو سنٹرل جیل سے اپنی میعاد اسیری گزرنے پر رہا کر دیے گئے ان دنوں دیگر احرار رہنما بھی پیشتر ازیں رہا ہو چکے تھے۔ سکھوں کی مسلسل اشتعال انگیزی کے باعث پنجاب کا مسلمان حالات سے مقابلہ کے لیے تیار تھا کہ مجلس احرار نے سکھوں سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جماعت نے حضرت امیر شریعت کو منتخب کیا کہ ایک بہت بڑے اجتماع میں سکھوں کے چیلنج کا جواب دیں۔ چونکہ امرتسر سکھوں کا مرکزی شہر تھا اس لیے قصہ زمین برسر زمین کے مصداق اس شہر کا انتخاب کیا گیا۔ اس اجتماع کی تشہیر ایک ہفتہ پیشتر سے شروع کی گئی۔ پنجاب کے اکثر شہروں سے مسلمان امرتسر پہنچ چکے تھے۔ عیدگاہ (بیرون رام باغ) کے وسیع میدان میں لاکھوں مسلمانوں کا سمندر امڈ آیا کہ عیدگاہ کو اپنی تنگ دامنی کا گلہ کرنا پڑا۔ ہواؤں نے اپنے دامن سنبھال لیے، دھوپ نے تمازت کم کر دی، آسمانوں کے ستارے سورج کی کرنوں سے جھانکنے لگے۔ رائج الوقت خادمین

کے محافظ آتشیں اسلحہ سے لیس ہو کر دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

نمازِ عصر کے بعد امیرِ شریعت اپنے احباب کے جلو میں عید گاہ پہنچے۔ خطبۂ مسنونہ کے بعد مسلم نوجوان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"غیرت حیران ہو کر آج نوجوانِ مسلمان کا منہ تکتی ہے کہ یہی اس قوم کے بے خبر فرزند ہیں جن کو انگلیوں پر گنی جانے والی قوم خون کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ جس قوم نے دجلہ اور فرات کو اپنے پاؤں تلے روندا اور تلواروں کے درمیان کھڑے ہو کر موت کو زندگی کی دعوت دی۔

بے خبر نوجوان! ہوش سنبھال اور عقل کے ناخن لے۔ سکھوں سے کہہ دو کہ ہمیں اپنی پایاب ندیوں سے نہ ڈرائیں، ہم تو خون کے بحرِ بیکراں میں گھوڑے دوڑانے کے عادی ہیں۔

آخر میں سکھوں سے خطاب کرتے ہوئے صرف دو فقرے کہے۔

سکھ صاحبان کو میرا مشورہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر بات کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہاتھوں سے دی ہوئی دانتوں سے کھولنی پڑے اور جس قوم کے سہارے وہ مسلمان کو خون کی ندیاں بہا دینے کی دھمکیاں دے رہے ہیں وہ ہندو قوم تو نو سو سال تک ہمارے گھٹنوں تلے رہی ہے"۔

امیرِ شریعت کی یہی تقریر امرتسر کے بعد سارے پنجاب میں گونجی۔ جس سے سکھوں کی للکار مدھم پڑ گئی۔ آخر گوردوارہ پربندھک کمیٹی لاہور کے ذمہ دار رکن سردار پرتاپ سنگھ ایڈووکیٹ نے امیرِ شریعت کی تقریروں کے بعد اپنے پریس بیان میں کہا:۔

"مسلمان دوستوں نے ہماری بات کا غلط مفہوم لیا ہے۔ ہمارا جھگڑا تو صرف حکومت اور کانگریس سے ہے۔ مسلمانوں سے ہماری کوئی لڑائی نہیں سکھ اپنے حقوق کے لیے صرف حکومتِ برطانیہ سے ٹکرائیں گے"۔

امیرِ شریعتؒ کو زہر دیا گیا

مئی ۱۹۳۲ء میں امیر شریعت کو مدرسہ عربیہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے شجاع آباد جانا پڑا۔ خان محمد انور خاں کی حویلی میں قاضی احسان احمد کی زیر صدارت امیر شریعت نماز ظہر کے بعد تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو قاضی صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"پان نہیں کھلاؤ گے؟"

قاضی صاحب نے حاجی نور محمدؐ کو پان لانے کے لیے کہا۔ حاجی صاحب تعمیلِ ارشاد کے لیے چلے ہی تھے کہ برابر کھڑے ایک آدمی نے کہا۔

"میں شاہ جی کے لیے پان لے آیا ہوں"

یہ کہہ کر پان حاجی نور محمد کے ہاتھ میں دے دیا اور انہوں نے قاضی صاحب کو دیا۔ امیر شریعت نے تقریر کے دوران جب یہ پان منہ میں رکھا تو ایک منٹ کے بعد کہا۔

"قاضی جی زہر دے دیا"

یہ کہتے ہوئے پان تھوک دیا اور قاضی جی نے اسے اپنے ہاتھ پر لے لیا۔ آن کی آن میں امیر شریعت کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑگیا اور قاضی صاحب کا ہاتھ بھی پھول کر ڈبل روٹی کی طرح ابھر آیا۔ تقریر سمیٹ لی اور جلسہ ختم کر دیا گیا۔ اس واقعہ نے شہر کے عوام کو پریشان کر دیا اور قاضی جی کا تمام گھر پاگل ہو گیا۔ ڈاکٹر لچھمن داس ریٹائرڈ سول سرجن نے امیر شریعت کو دیکھ کر تشخیص کی کہ انہیں واقعی زہر دے دیا گیا ہے۔

اس وقت پیاز کا پانی بڑی مقدار میں تیار کرایا گیا۔ ڈاکٹر نے اس پانی سے دوا دینا شروع کی تو جسم سے زہر کا رنگ پیشاب اور پاخانے کے راستے خارج ہونا شروع ہوا۔ پیاز کے مسلسل استعمال سے رات تین بجے تک جسم کا تمام زہر خارج ہو گیا۔ اس دوران ڈاکٹر لچھمن داس امیر شریعت کے سرہانے بیٹھے رہے۔ آخر ساڑھے تین بجے

---

[۱] سالار جیوش احرار کروڑ پکا ضلع ملتان۔

رات ڈاکٹر نے قاضی صاحب کو مبارک باد دی کہ اب شاہ جی خطرے سے باہر ہیں۔

زہر دینے والے کو پولیس صبح ہونے تک گرفتار کر چکی تھی۔ اس کا نام سید عنایت اللہ شاہ یا ولایت شاہ تھا۔ بہرحال جب اسے امیر شریعت کے سامنے لایا گیا تو امیر شریعت نے اپنے زہر دینے والے سے مخاطب ہو کر صرف اتنا کہا۔

"بھائی میں نے آپ کا کیا نقصان کیا تھا؟"

پھر پولیس افسر سے کہا

"میں اس سے کوئی انتقام لینا نہیں چاہتا۔ خدا کے لئے تعالیٰ اسے معاف فرمائیں آپ بھی معاف کر دیں۔"

اگر ملزم پر قانون گرفت کرتا تو ممکن ہے ارتکاب جرم کا انکشاف ہوتا مگر امیر شریعت کی بلند حوصلگی نے یہ راز نہ کھلنے دیا کہ زہر کیوں دیا گیا تھا اور اصل مجرم کون تھا۔

آگرہ اور بمبئی کے بعد امیر شریعت پر قتل کا یہ تیسرا حملہ تھا۔ گو حملوں کی نوعیتیں مختلف رہیں مگر مقصود میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ قاتل اور مقتول بھی ایک دوسرے سے اوجھل نہیں ہوئے۔ چونکہ موت و حیات کے مابین انسانی ارادے کو کوئی دخل نہیں اس لیے موت کا ہر اوچھا وار زندگی کی راہ میں مرگ ناگہاں ثابت نہ ہو سکا اور نہ ہی امیر شریعت کے مقاصد میں کوئی دیوار حائل ہو سکی۔

پنڈت کرپا رام برہمچاری

انہی دنوں میر پور (کشمیر) کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ اجلاس میں امیر شریعت کو شمولیت کی دعوت ملی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ لیکن ریاستی [illegible]

امیر [illegible]

پولیس اپنے ارادے میں مایوس ہوئی کیونکہ امیر شریعت گھر نہیں تھے۔ اس ناکامی کے بعد پنجاب بھر کے تمام پولیس اسٹیشنوں کو مطلع کر دیا گیا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو کسی صورت اور کسی راستے سے بھی کشمیر کی حدود میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ نیز تمام ریلوے اسٹیشنوں، لاریوں کے اڈوں اور دوسرے پیدل پہاڑی راستوں پر خفیہ پولیس تعینات کر دی گئی اور اس طرح امیر شریعت کے کھوج میں پوری مشینری حرکت میں آگئی۔ امیر شریعت کو حکومت کے اس ارادے کی اطلاع ضلع جالندھر کے ایک گاؤں میں دی گئی۔

انسان اگر اپنے عزم میں مخلص ہو تو آسمانوں کی بلندیاں اُس کے قدم لیتی ہیں۔ ستارے فرشِ راہ ہوتے ہیں۔ سورج کی کرنیں اسے چاند کے ہالے تک لے جاتی ہیں لیکن حوصلے کی پستی خلوص کی معراج تک پہنچ کر بھی انسان کو اس کی شکست سے نہیں بچا سکتی۔ تمام آئینی پابندیوں کے باوجود امیر شریعت نے اپنے وعدے پر میرپور پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ پولیس اس یقین پر کہ امیر شریعت اب گھر نہیں آئیں گے اس مورچہ سے غافل ہو گئی۔ اسی رات بارہ بجے امیر شریعت گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ میرپور سے کوئی صاحب آپ کو لینے آئے ہوئے ہیں اور اس وقت وہ محلہ کی مسجد میں سو رہے ہیں۔ امیر شریعت نے انہیں بیدار کیا اور صبح چھ بجے کی گاڑی روانگی کا فیصلہ کر کے وہیں سو گئے۔ رات چار بجے اسٹیشن کے ایک ویران کونے میں جا پہنچے۔ نیز ساتھی سے کہہ دیا کہ تم گاڑی میں میرے ساتھ نہ بیٹھنا۔ اگر مجھے آواز دینے کی ضرورت ہو تو شاہ جی کی بجائے "پنڈت کرپارام برہمچاری" کہہ کر آواز دینا۔ ہندی میں پنڈت کے معنی اونچی ذات کے ہیں اور مسلمانوں کے ہاں سید، سردار کے معنی میں مستعمل ہے۔ کرپا ہندی میں عطا کرنے کو کہتے ہیں اور "رام" اللہ کے ہم معنی استعمال ہوتا ہے۔ ہندی میں برہمچاری مجرد کو کہتے ہیں۔ امیر شریعت نے بخاری کا وزن برابر رکھنے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا۔ اس طرح پنڈت کرپارام برہمچاری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ہم معنی بن گیا۔ یوں امیر شریعت نے اپنے بلند مقاصد کی ادائیگی اور پولیس کی گرفت سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے نام کا ہندی ترجمہ

کر لیا تاکہ پولیس یا کوئی دوسرا سرکاری آدمی چوکس نہ ہو۔

نیلے رنگ کا تہبند، نیم آستین کی واسکٹ، سر پر موٹے کھدر کی سفید پگڑی اور ہاتھوں سے خالی ——— لیکن پنجاب پولیس امیر شریعت کو مندرجہ ذیل لباس میں دیکھنے کی عادی تھی ——— سر پر کپڑے کی گول ٹوپی، نیم آستین کا لمبا کرتہ گھٹنوں سے اونچا پاجامہ اور ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا۔

اجنبی لباس میں امیر شریعت نہ تو پولیس سے پہچانے گئے اور نہ ہی سفر میں کسی دوسرے مسافر سے۔ جہلم کے اسٹیشن پر اترتے وقت ضرورت پڑی تو ہمراہی نے امیر شریعت کو تلاش کے لیے پنڈت کرپا رام کہہ کر مسلسل پکارا۔ مگر امیر شریعت اسے ریلوے حدود سے دور جا کر ملے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام - ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میرپور، جہلم سے نو میل دور دریائے جہلم کے اس پار آبادی کا نام ہے۔ یہ کشمیر کے ان باشندوں پر مشتمل ہے جن کے اکثر افراد پہلی جنگ عظیم میں بھرتی ہو کر استعماری فوج کے دوش بدوش لڑ چکے تھے۔ تحریک کشمیر کے دنوں بھی اسی بستی کے عوام نے اپنی آزادی کے لیے مجلس احرار کے تحت بڑی قربانی کی تھی۔ پولیس کے انتظامات امرتسر سے جہلم تک مکمل ہو چکے تھے لیکن مجرم محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنی منزل کے سامنے کھڑا تھا۔

میرپور کے سامنے سے گزرتے ہوئے دریائے جہلم کی چیخ و پکار سے پتھروں کے دل دھڑک رہے تھے۔ ناخدا کشتیوں کے پتوار پھیلائے موجوں سے برسرِ پیکار تھے کہ امیر شریعت نے پتن پر قدم رکھا۔ پولیس ہر مسافر کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے امیر شریعت نے پتن سے دریا کو عبور کرنا مناسب نہ سمجھ کر دو میل اوپر جا کر دریائے جہلم کو پار کیا اور پھر کئی میل پیدل سفر کے بعد میرپور میں داخل ہو گئے۔

ہمراہی کو متنبہ کیا کہ تم جاؤ لیکن میری آمد کی اطلاع نہ کرنا۔ میں آپ سے آپ جلسہ میں پہنچ جاؤں گا۔

انجمن کے سالانہ اجلاس کا آخری دن تھا۔ ریاستی حکام مطمئن تھے۔ برطانوی پولیس اپنے کارنامے پر خوش تھی کہ عطاء اللہ شاہ بخاری ریاست میں داخل نہیں ہو سکا۔ منتظمین نے اس خوف سے کہ انجمن کی بدنامی نہ ہو اور رات کے اجلاس میں لوگوں کی حاضری کم نہ ہو شہر میں منادی کرا دی کہ رات آخری اجلاس میں امیر شریعت عوام سے خطاب کریں گے۔ اجلاس شروع ہوا تو صدر جلسہ نے قوم سے معذرت کی۔

"ہمیں افسوس ہے کہ امیر شریعت ریاستی اور برطانوی قانون کی پابندیوں کے باعث تشریف نہ لا ——————"

ابھی یہ فقرہ ادھورا تھا کہ امیر شریعت نے جلسے کے ایک کونے سے آواز دی۔ "آپ غلط کہتے ہیں"۔ یہ فقرہ کہتے ہوئے اور مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج کی جانب بڑھتے گئے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کون دیہاتی ہے کہ صدر استقبالیہ کی بات کاٹ رہا ہے۔ اب امیر شریعت سٹیج پر تھے اور بھاری بھر کم کھدر کی پگڑی اتار کر عوام کے سامنے کھڑے تھے۔ اس وقت مجمع کا حال دیکھنے والا تھا۔ آخر امیر شریعت نے صبح چار بجے تک تقریر کی۔

امیر شریعت کے میر پور پہنچنے کے نتیجہ میں [illegible]

[illegible] تھا اور مرزائی امت بہت بڑی اکثریت میں یہاں آباد تھی۔ مرزائیوں [illegible] نے یہاں حکومتی طرز پر اپنا نظام قائم کر رکھا تھا، جس کے تحت مختلف شعبے اور دفاتر قائم تھے۔ عملاً اس قصبہ میں خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود کی حکومت تھی۔

غیر مرزائی عوام مسلمان، ہندو اور سکھ اپنی مذہبی اور معاشی زندگی میں آزاد نہ تھے۔ یہاں تک کہ خلیفہ قادیان کی جانب سے ہر غیر مرزائی دکاندار کو یہ حکم تھا کہ اپنی دکانوں پر درج ذیل عبارت نمایاں طور پر آویزاں رکھیں۔

"میں آئندہ سے مرزا غلام احمد کو حضرت مرزا غلام احمد صاحب کہوں گا۔"

میں اپنے کسی مذہبی اجتماع میں شامل نہیں ہوں گا اور نہ ہی قادیان میں اپنے کسی عقیدے کے بزرگ کو آنے کی دعوت دوں گا۔

میں کسی ایسے دکاندار سے لین دین نہیں کروں گا جس کے پاس یہ اقرار نامہ نہیں ہوگا۔"

۱۹۲۸ء مولانا عبدالکریم[1] اور ان کے خاندان نے مرزائیت سے تائب ہونے کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں انہیں سخت اذیتیں دی گئیں اور ان کی غیر منقولہ جائداد کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں یہ خاندان ترکِ مرزائیت کے بعد قادیان سے بٹالہ منتقل ہو گیا۔

احرار رہنماؤں کی نظر میں مرزائی دینِ اسلام کے باغی اور برطانوی سامراج کے کھلے ایجنٹ تھے۔ مرزائیوں کے مظالم انتہا کو پہنچ چکے تھے لیکن کوئی باز پرس نہ تھی۔ اس پر احرار رہنماؤں نے ریاست کشمیر کی طرح قادیان کے عوام کی خدمت کرنا بھی دینی اور سیاسی ثواب سمجھا۔

چنانچہ ۱۹۳۳ء میں احرار نے قادیان میں اپنا دفتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور در پردہ دفتر کے لیے مکان کی تلاش شروع کر دی۔

قادیان کے مظلوم اور بےکس عوام کی زبردست خواہش تھی کہ کوئی ان کے زخموں کی مرہم بن کر یہاں آئے مگر ان کے دل خلیفہ قادیان کی قوت کے خوف سے دہشت زدہ تھے وہ ہر اجنبی کو قادیانیوں کا جاسوس سمجھ کر نگاہیں ملانے سے کتراتے تھے۔ آخر مولانا عبدالکریم

---

[1] اس وقت کے مرزائی مبلغ۔

کے نیم سوختہ مکان میں دفتر مجلس احرار کی بنیاد رکھی گئی۔ علاؤ الدین اور غریب شاہ نامی دو رضاکاروں کو یہاں متعین کیا گیا۔ مرزائیوں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے دونوں رضاکاروں کی خوب پٹائی کی اور مولانا عبدالکریم کے مکانوں کو مزید جلا کر خاک کر دیا۔

ان واقعات کی روشنی میں مجلس احرار نے اپنی تمام توجہ قادیاں کی طرف مبذول کرنے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۳۳ء اپنے مخصوص سیاسی حالات اور فرقہ وارانہ فضا کی بدولت ایک ہمہ گیر سال تھا۔ اس سال اور کسی دوسری تحریک کو ہوا دینا غیر ملکی حکمرانوں کی عمر بڑھانے کے مترادف تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی سامراج نے جن تحریکات کو از خود جنم دے کر پروان چڑھایا تھا، مرزائیت اسی پودے کا اہم بیج تھا۔ احرار رہنماؤں کے تدبر نے اس سے چشم پوشی کو ہندوستان سے غداری اور اسلام کے بنیادی عقیدۂ ختم نبوت سے انحراف سمجھ کر قادیان کے نظام حکومت میں دراڑ ڈالنا ضروری خیال کیا۔ چنانچہ ۲۱-۲۲-۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو قادیان میں امیر شریعت کی صدارت میں تبلیغی کانفرنس کرنے کا اعلان کیا۔ اس فیصلے سے مرزائی اور حکومت اپنی اپنی جگہ سوچ میں پڑ گئے۔ پنجاب میں خصوصاً احرار رضاکاروں نے کانفرنس میں شمولیت کی تیاریاں شروع کر دیں۔

برطانوی سامراج ذہنی طور پر اس تحریک سے مقابلے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ کانگریس اور دوسرے مسلمان رہنما حقوقِ قومیت اور سوراج کی سرد جنگ میں مصروف تھے۔ دوسری جانب انگریز بین الاقوامی سیاست میں جرمن اور روس کے اتحاد میں الجھا ہوا تھا۔ بایں ہمہ احرار کشمیر کی لڑائی میں جس قوت کا مظاہرہ کر چکے تھے، حکومت اس سے بھی غافل نہیں تھی۔ تاہم احرار سے الجھاؤ نامناسب سمجھ کر کانفرنس کی تیاریوں میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی گئی۔ حکومت کی اس سرد مہری کو دیکھتے ہوئے مرزائیوں نے واویلا کیا تو حکومت نے قادیاں کی میونسپل حدود میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ حکومت کے اس رویّہ

نے احرار کو ایک نیا ولولہ دیا لیکن وہ لڑائی کے موڈ میں نہیں تھے۔ لہٰذا قادیان کی میونسپل حدود سے باہر غیر مسلموں سے کانفرنس کے لیے جگہ حاصل کر لی گئی۔ ہندو سبھا ہائی اسکول کی عمارت مہمانوں کے لیے اور سردار ایشر سنگھ کی زمین کانفرنس کے پنڈال کے لیے لی گئی۔

پنجاب کے مختلف شہروں سے احرار رضاکاروں کے قادیان پہنچنے کے لیے ریلوے حکام نے سپیشل گاڑیاں چلانے کا انتظام کیا۔ دہلی تک کے رضاکار لدھیانہ ریلوے اسٹیشن پر اور پشاور تک کے رضاکار لاہور ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو گئے۔ دونوں اسپیشل گاڑیاں جب مقررہ اوقات پر قادیان کو روانہ ہوئیں تو یہ نظارہ بھی دیدنی تھا۔ گاڑی کے انجن اور ہر ڈبے پر مختلف مقام کے رضاکاروں کے سرخ جھنڈے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ جب دونوں اسپیشل گاڑیاں امرتسر پہنچیں تو امیر شریعت ان کے استقبال کے لیے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ دونوں کے درمیان امرتسر سے امیر شریعت کے لیے ایک تیسری گاڑی کا علیحدہ انتظام تھا۔ جس میں بٹالہ اور دوسرے اضلاع کے رضاکاروں کو سوار ہونا تھا۔ احرار کا یہ سرخ اژدہا امیر شریعت کی معیت میں جب قادیان پہنچا تو اس سرزمین نے ایک نئی کروٹ لی۔ کفر پر اسلام کی یلغار اس عہد کا عظیم واقعہ تھا۔

امیر شریعت قادیان ریلوے اسٹیشن سے ہزاروں رضاکاروں کے جلو میں پیدل پنڈال تک پہنچے، جہاں ایک نیا شہر آباد تھا۔ ہر طرف چھولداریاں اور خیمے نصب تھے۔ ان پر لہراتے ہوئے سرخ پرچم ہواؤں سے کھیل رہے تھے۔ سرخ وردیوں میں احرار رضاکار اس طرح لگتے جیسے بیر بہوٹیاں پہاڑوں کی شاہراہوں پر بکھری پڑی ہوں۔

احرار رہنماؤں کے علاوہ ہر مکتب فکر کے علماء نے اس اجتماع میں شرکت کی۔

جاگنے کی تاکید کر دی۔ ہواؤں نے مہمانوں پر اپنے سائے پھیلا دیے۔ چاند نے رات کے اندھیرے پر اپنی سفید چادر ڈال کر کفر کا مکروہ چہرہ ڈھانپ دیا۔ امیر شریعت گویا ہوئے تو کفر گوش برآواز تھا۔ تمام رات دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور سنتے رہے۔ صبح کی اذان کے ساتھ امیر شریعت نے اپنی تقریر ختم کی۔ کانفرنس کی باقی کارروائی تین دنوں میں مکمل ہوئی

گرفتاری سانحہ شجاع آباد نے حرم امیر شریعت کو ایسا غم دیا کہ وہ دائم المریض ہو کر رہ گئیں زہر ملنے کی اطلاع جیسے ہی امرتسر پہنچی۔ گھر میں اہلیہ محترمہ کو خون کی قے آئی۔ بعد میں ڈاکٹروں کی تحقیق نے ٹی بی کی نشاندہی کر دی۔ امیر شریعت کی تہی دامنی اس شاہی مرض کے علاج کی متحمل نہیں تھی۔ وہ خاصے پریشان رہنے لگے۔ سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں میں تعطل آ گیا۔ مسکراتا چہرہ گھریلو پریشانیوں کی نظر ہو گیا۔ مخالف موسم مرض کا ہمنوا ہوا ڈاکٹروں نے رائے دی کہ مریضہ کو کسی پہاڑی مقام پر رکھا جائے لیکن گرہ میں اس قدر حوصلہ کہاں تھا کہ پہاڑوں کا بوجھ سہہ سکے۔ تاہم بادلِ نخواستہ دوستوں اور حکماء کی رائے پر سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ بیوی بچوں کو مسوری لے گئے۔ وہاں علاج شروع کر دیا گیا۔

ایک دلچسپ واقعہ اگر گھریلو معاملات میں اطمینان نہ ہو تو قلب و نظر کا سکون بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ امیر شریعت دیکھنے کو مسوری ایسی خوشنما اور دلفریب فضا میں رہ رہے تھے مگر رفیقہ حیات کی بیماری نے یہ جنت بھی جہنم بنا دی تھی۔ اسی عالم میں ایک دن امیر شریعت کی چھ سات سالہ بچی گھر سے کھیلنے بازار اتری کہ غائب ہو گئی۔ بچی کی گمشدگی نے سارے گھر کے ساتھ ساتھ حلقہ احباب کو بھی پریشان کر دیا۔ مسوری کے نشیب و فراز کھنگال ڈالے گئے مگر بچی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ بستر پر مریضہ کی حرارت بڑھ گئی۔ برطانیہ جیسی سلطنت کو للکارنے والا پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا۔ دوستوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اسی طرح دن گزر گیا اور شام کے چراغوں نے مسوری کو جگمگا دیا۔ اتنے میں ایک انگریز خاتون بچی کو لے کر گھر پہنچی۔ دیکھتے ہی

امیر شریعت نے بچی کو سینے سے لگا لیا اور انگریز عورت سے تلخی اور غصے میں کہا۔

"تم نے یہ کیا کیا؟ تم کون ہو؟ میرے گھر کا نظام تو نے درہم برہم کر دیا"

انگریز خاتون! امیر شریعت کی یہ گفتگو نہ سمجھ سکی۔ مگر اس نے انگریزی میں کہا۔

"عرصہ ہوا میری بچی جو شکل و صورت میں بالکل ایسی ہی تھی فوت ہو چکی ہے۔ مجھے یہ بچی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ میں آپ کی اطلاع کے بغیر اسے لے گئی۔ مجھے معاف کریں لیکن آئندہ ہر صبح میں اسے یہاں سے لے جایا کروں گی اور شام کو چھوڑ جایا کروں گی"

اس پر امیر شریعت نے کہا:

"تو ماں ہے! اگر ماں کے دکھی دل کو میرے دل کے ٹکڑے سے کوئی سکون مل سکتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن یہ دیکھنا کہ اس کی مریض والدہ بھی اسی کے سہارے زندہ ہے"

چنانچہ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کئی دنوں کے بعد انگریز خاتون اپنے خاوند کے ساتھ مسوری سے جانے لگی تو اس نے بلیوں کا نہایت خوبصورت جوڑا بچی کے کھیلنے کے لیے دیا۔ بلیاں اچھی نسل کی تھیں۔ گھر کے ہر فرد سے مانوس ہو گئیں۔ بچی کو کھیلنے کے لیے جیتے جاگتے کھلونے مل گئے۔

قادیاں تبلیغ کانفرنس نے مرزائی خلافت اور ایوانِ برطانیہ میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ مرزائیت کی اڑتی ہوئی خاک میں خلیفہ قادیاں کو موت کے نقشے ابھرتے دکھائی دینے لگے۔ باطل دعوؤں کی ایک ایک لکیر مٹنے لگی۔ آخر خود کاشتہ پودے کی حفاظت کے لیے امیر شریعت کو قادیاں کانفرنس کی تقریر کی بنا پر دفعہ ۱۵۳ اے کے تحت مسوری سے ۷۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن دوسرے ہی دن ڈیرہ دون سے انہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ یہ ضمانت ڈاکٹر محمد امیر صاحب نے دی جو ان دنوں ڈیرہ دون ڈسٹرکٹ ہسپتال کے انچارج تھے۔

امیر شریعت کی گرفتاری پر اہل خانہ تو بہرحال پریشان تھے لیکن بلیوں کے جوڑے میں سے نر نے تمام دن اور رات بغیر کچھ کھائے مکان کی چھت پر کھلی فضا میں وقت گزارا حالانکہ گھر کے سب لوگ اسے دودھ پینے کے لیے پچکارتے رہے مگر وہ نیچے نہ اترا۔ جیسے ہی امیر شریعت ضمانت پر رہا ہو کر سوری پہنچے اور گھر والوں نے ان سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے فوراً آواز دی۔ بلا جلدی سے نیچے اتر کر امیر شریعت کے پاؤں چاٹنے لگا اور دودھ بھی پی لیا۔

مجذوب کی دعا

مقدمہ گورداسپور کی مصروفیت کے باوجود امیر شریعت اپنے مشن کے لیے رواں دواں رہے۔ ۱۹۳۴ء کا سال آخری دموں پر تھا کہ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر امیر شریعت کو ملتان جانا پڑا۔ جلسے کی حاضری تاحدِ نظر تھی اور اس پر خاموشی کا یہ عالم جیسے انسانی سروں پر پرندے بیٹھے رہے ہوں۔ رات کے اس سکوت کو صرف امیر شریعت کی آواز توڑ رہی تھی۔ واقعہ معراج النبی کا ذکر کرتے ہوئے اسے تمثیلی انداز میں پیش کیا۔ اور حاضرین کی محویت کا یہ عالم تھا کہ وہ محسوس کرنے لگے جیسے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری ان کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ عین ایسے وقت پر مجمع سے ایک مجذوب اٹھا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اس نے ملتانی زبان میں کہا۔

"وو سیّدا! شالا اتھائیں دفن تھیویں"! (اے سیّد! خدا کرے آپ یہیں (ملتان میں) دفن ہوں)

شاید یہ قبولیت کا وقت تھا کہ دل سے نکلی ہوئی بات حقیقت بن کر رہی۔

مقدمہ کی روئیداد

بظاہر ۱۵۳ کا مقدمہ اپنے اندر کوئی ایسی جاذبیت نہیں رکھتا کہ قانون اور ملزم کے درمیان انصاف کرنے والی عدالت کو الجھاؤ محسوس ہو۔ لیکن امیر شریعت کے اس مقدمہ نے نہ صرف عدالت کو بلکہ حکومت کی

پوری مشینری کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ مقدمہ کے دوران ہر پیشی پر ہزاروں انسانوں کا کچہری کے احاطہ میں ہجوم، عدالت کو بارگراں ثابت ہوتا۔ اس روز دیگر عدالتوں کا کام بھی معطل ہو جاتا۔ امرتسر سے گورداسپور کے درمیان ریل گاڑیوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ ملتی۔

جمعۃ الوداع

انہی دنوں مجلس احرار نے اعلان کیا کہ رمضان المبارک کا آخری جمعہ گورداسپور میں امیر شریعت پڑھائیں گے۔ اس اعلان کے ہوتے ہی پنجاب بھر کے مسلمان گورداسپور پہنچنے کے لیے پر تولنے لگے۔ حکومت پنجاب نے بھی جو شروع سے مسلمان اور قادیانیوں کے درمیان تماشائی تھی، جمعہ کے اجتماع میں مداخلت مناسب نہ سمجھی۔

شہر سے باہر کھلے میدان میں نماز جمعہ کا انتظام کیا گیا۔ گورداسپور کی سرزمین اس روز اپنے مہمانوں کو سنبھالنے سے قاصر تھی۔ شہر کا دامن اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ تنگی دامنی کا شکوہ کر رہا تھا۔

امیر شریعت سر پر عربی طرز کا رومال باندھے، ہاتھ میں کلہاڑی سنبھالے جب جمعہ کے خطبہ پر کھڑے ہوئے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی عربی شہسوار ہے جو ابھی گھوڑے سے اتر کر فوج سے میدان جنگ میں خطاب کر رہا ہے۔ زبان کی شیرینی کلام کی صورت میں بانٹی جا رہی تھی۔ جس سے لاکھوں انسانوں کی دلوں کی جھولیاں بھر رہی تھیں۔ نظریں تھیں کہ امیر شریعت کو چاٹ رہی تھیں۔ دل تھے کہ بلیوں اچھل رہے تھے اور امیر شریعت تھے کہ لاکھوں انسانوں کے جذبات سے کھیل رہے تھے۔

نماز سے فارغ ہو کر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے امیر شریعت کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز پیش کر دی جسے امیر شریعت نے قبول کر لیا۔ سا ایک ایک آدمی آگے بیعت

کے لیے آتا تو ہفتوں گزر جاتے مگر امیر شریعت نے حکم دیا کہ میرے رومال کے ساتھ ایک پگڑی کو گرہ دے لو اور پھر اس سے تو لیے، رومال، چادریں اور پگڑیاں باندھتے جاؤ جس کا ہاتھ ان کپڑوں سے لگ جائے وہ میری بیعت میں اپنے کو داخل سمجھے ۔ بس پھر کیا تھا۔ لاکھوں انسانوں کے سروں پر پگڑیوں، چادروں، تولیوں اور رومالوں کا ایک جال بن دیا گیا ۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو امیر شریعت نے بیعت ہونے والوں کو شرعی احکام سمجھائیے نیز فرمایا کہ کل ہر شخص اپنے اپنے گھر پہنچ کر ایک پوسٹ کارڈ پر اپنا نام اور پتہ درج کر کے مجھے بھیج دے۔

۲۳۔ مارچ ۱۹۲۵ء کو جب خلیفہ قادیاں مرزا بشیر الدین محمود، امیر شریعت کے مقدمہ میں بطور گواہ صفائی اپنی شہادت دینے آئے تو خطوط سے بھری ہوئی سات بوریاں امیر شریعت نے عدالت کے سامنے پیش کیں جو بیعت کرنے والوں نے اطلاعاً لکھے تھے تا کہ حکومت اور خلیفہ قادیان کو معلوم ہو سکے کہ میرے روحانی مریدوں کی تعداد بھی کئی لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔

خلیفہ قادیاں کی شہادت چار دن تک جاری رہی اور اس دوران اس کی نگاہیں بار بار خطوط سے بھری ہوئی ان بوریوں سے ٹکراتی رہیں۔

فردِ جرم

عدالت نے امیر شریعت پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے لکھا:۔

"ملزم نے اپنی تقریر کے دوران ملکِ معظم کی رعایا کے دو طبقات احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان دشمنی یا حقارت پیدا کرنے کی کوشش کی"

لفظ "طبقات" مذہبی فرقوں پر اطلاق پاتا ہے۔

امیر شریعت نے فردِ جرم کے جواب میں کہا:۔

"میری تقریر کے جن حصوں کے متعلق شکایت کی گئی ہے وہ مسخ شدہ عبارتیں ہیں جس سے میری اصل تقریر کے معنی ہی بدل دیئے گئے

میں اقبال کرتا ہوں کہ میں نے اپنی تقریر میں یہ لفظ کہے تھے کہ نبی دھوکے باز نہیں ہوتا۔ تبلیغ کانفرنس میں جہاں میں نے سچے اسلام کی اشاعت کے لیے خطبہ صدارت پڑھا تھا مرزا بشیرالدین اور مسلمانوں میں حقارت پیدا کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ مرزائی چالیس کروڑ مسلمانوں کو مرزا غلام احمد کو نبی نہ ماننے کی وجہ سے کافر سمجھتے ہیں اور چونکہ یہ مذہبی اختلافات ہیں۔ اس وجہ سے احمدیوں اور غیر احمدیوں میں شادی بیاہ کے اور دوسرے تعلقات ممکن ہی نہیں۔ مرزائی مسلمانوں کے بچوں کا جنازہ بھی نہیں پڑھتے اور وہ مسلمانوں کے متعلق خنزیر کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ان کی عورتوں کو گالیاں دیتے ہیں اور کتیا سے بھی برے لفظ استعمال کرتے ہیں۔"

اگر ضرورت ہوئی تو میں ایک تحریری بیان شامل کروں گا۔

تحریری بیان دیوان سکھانند ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گورداسپور نے امیر شریعت کے تحریری بیان کے حسب ذیل اقتباسات اپنے فیصلے میں نقل کیے ہیں۔

"شعبہ تبلیغ مجلس احرار کا فرض تھا کہ اسلامی دنیا کو متنبہ کر دے کہ وہ اپنے تئیں جماعت قادیانی کے فریب، دھوکوں، غلط الزامات اور عیاریوں سے بچائیں۔

"ضمیمہ انجام آتھم اور "نزول المسیح" جو مرزا غلام احمد قادیانی بانی جماعت کی لکھی ہوئی

[illegible]

گالیوں سے [illegible] ہیں۔

"خداوند یسوع المسیح کو بھی اس مسیح موعود نے نہیں چھوڑا۔"

"تریاق القلوب" "نور الحق" اور بہت سی کتابیں مرزا غلام احمد کی لکھی ہوئی اور انگریزوں کے ساتھ اس کی وفاداری اور چاپلوسی اور برٹش گورنمنٹ کی بے نظیر خدمات کا ثبوت ہیں۔"

"نورالحق" میں مرزا غلام احمد نے لکھا ہے کہ گورنمنٹ (برطانیہ) سے غداری خدا اور رسول سے غداری کے برابر ہے اور اگر اس بارے میں مرزائی بھی غدار ہو جائیں تو ان سے بڑا غدار کوئی نہ ہوگا۔"

"میں نے کہا تھا کہ او بڑھیا! تو نبی بنا تھا تو تجھے وہی وقار قائم رکھنا چاہیے تھا۔ جب نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو تمہیں انگریزوں کے کتے نہ بننا چاہیے تھا۔ تم انگریزوں کے بغیر دم کے کتے ہو۔"

"موجودہ خلیفہ کے وقت میں قادیان کے لوگوں پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا جاتا ہے اور تشدّد کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس ڈر کے مارے کوئی عینی شاہد واقع شدہ مظالم کی گواہی دینے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔ محمد امین کو دن دہاڑے مار ڈالا گیا۔ مباہلہ بلڈنگ گرا کر جلا دی گئی لیکن حکومت مجرموں کو پکڑ نہ سکی۔ نہ ان کا چالان کیا گیا اور نہ کوئی اور کارروائی ان کے خلاف کی گئی۔ یہ موجودہ خلیفہ کی حکومت کا نتیجہ ہے اس کا اثر مظلوموں اور ان کے ہم خیالوں کے دلوں پر ظاہر ہے۔ ان لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سوائے خلیفہ کے انگریزوں کی کوئی حکومت قادیان میں نہیں اور خلیفہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ محمد امین کے قتل سے ان مسلمانوں میں تبلیغ کرنے کا راستہ کھل گیا جن کے دل پہلے ہی ڈر سے زخمی ہو گئے تھے۔"

"ملزم نے اس شخص کو چیلنج کیا جسے اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا اور جس سے تمام ڈرتے تھے۔ مرزائیوں اور ان کی نبوت اور خلافت کے متعلق ملزم نے کہا کہ اب یہ نہیں رہے گا۔"

"ملزم نے بیان کے آخری حصے میں بطور صفائی کے کہا کہ جماعت احمدیہ نے اپنے کاموں سے اپنے خلاف دنیا میں اتنی نفرت پیدا کر لی ہے کہ میرے لیے ان کے خلاف

لہ ۔ پنجابی لفظ ہے۔

نفرت پیدا کرنا بے فائدہ تھا۔ بالخصوص اس حالت میں میرا مقصد یہ نہ تھا کہ میں نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔"

(امیر شریعت کی تقریر جسے عدالت نے اپنے فیصلے میں نقل کیا)

"اب ہم ملزم کی تقریر کی طرف آتے ہیں۔ سامعین جو کہ اکثر گنوار تھے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ملزم نے دوران تقریر کہا۔ اس علاقہ میں جہاں بنت خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں ہم غریبوں کا اکٹھا ہونا جن میں سے اکثر کا کوئی گھر بھی نہیں، کوئی معمولی بات نہیں۔ پھر ملزم نے کہا، فرعون کا تخت الٹا جا رہا ہے اور خدا نے چاہا تو یہ نہیں رہے گا۔ پھر قادیان کے متعلق ملزم نے کہا۔ اس علاقہ میں حکومت کے اندر ایک اور حکومت پیدا ہو گئی ہے جہاں ظلم، نا انصافی، تکبر اور غرور اتنا بڑھ گیا ہے کہ جب بخاری مسوری سے امرتسر کو آیا تو پولیس سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہی اور امرتسر پہنچنے پر اسے دفعہ ۱۴۴ کے تحت دو سب انسپکٹروں نے نوٹس دیا۔ اس موقع پر ملزم نے پولیس کو جنوں کی فوج قرار دیا۔ پھر تقریر کرتے ہوئے کہا، اللہ اللہ! قادیاں میں غریب شاہ پٹ جاتا ہے مظالم سمجھتا ہے کہ وہ مر گیا اور حکومت کہتی ہے کہ گواہ نہیں ملتا۔ یہ چشم پوشی ہے۔ اور ہم اتنے ذلیل ہیں۔ اس لہجہ میں ملزم نے قادیاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں احمدیوں نے ریاست بہاولپور، پٹیالہ اور کشمیر جیسے اختیارات حکومت سے حاصل کر لیے ہیں اور ہمیں استنجا تک کرنے کی اجازت نہیں۔

پھر اس موقعے پر قیام امن کے لیے پولیس متعین کیے جانے کی طرف اشارہ کر کے اور احمدیوں کی اس کانفرنس کے ناکام کرنے کی کوشش کی طرف اشارہ کر کے ملزم نے کہا کہ اگر یہ احرار کی تبلیغی کانفرنس نہ ہوتی تو نہیں معلوم کیا ہو جاتا۔ آج پیروان حسین ہتھکڑیاں پہنے ہوتے۔

ملزم نے لوگوں کو تلقین کی کہ دلیری سے تکلیفیں برداشت کریں اور اپنے رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کی پیروی کریں۔ ملزم نے خلیفہ قادیاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
یہ بھی کہا کہ وہ ایک نبی کا بیٹا ہے۔ میں نبی کا نواسہ ہوں۔ وہ آئے تم خاموش بیٹھے رہو۔ وہ میرے
ساتھ اردو، پنجابی، عربی اور فارسی میں تمام مسائل پر بحث کرے تو اس جھگڑے کا آج ہی
فیصلہ ہو سکتا ہے۔ وہ پردے سے نکلے، گھونگٹ اٹھائے اور حکومت کو ہمارے اختلاف
کے بارے میں درمیان میں نہ لائے۔ وہ کشتی کر لے اور مولا علیؓ کے جوہر دیکھے اور جس شان
سے چاہے آئے۔ وہ موٹر میں آئے میں پیدل آؤں۔ وہ حریر پہن کر آئے میں کھدر کا
کرتہ پہن کر آؤں۔ وہ اپنے ابا کی سنت کے مطابق عنبر، بھنا ہوا گوشت، یاقوتیاں اور
پلومر کی ٹانک وائن پی کر آئے اور میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی کھا
کر آؤں۔ اسے حکومت سے مدد نہیں مانگنی چاہیے اکیلا آئے اور بخاری کے جوہر دیکھے۔
اگر ہم یہاں دو چار سال رہے تو خدا کے فضل سے یہ بالکل تباہ ہو جائیں گے۔
اخبار "زمیندار" اور اس کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور
اپنے اس کانفرنس کے صدر ہونے کی طرف اشارہ کر کے ملزم نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان
کے کسی مولوی میں اس طرح قادیاں میں آنے کی طاقت نہیں۔ یہ کسی اکیلے آدمی کا کام
نہیں۔ یہ ایک جماعت کی طاقت ہے۔ جماعت کے سر پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ حکومت
آج آزما کر دیکھے کہ باوجود پابندیوں کے جو حکومت نے لگا دی ہیں اور باوجود جماعت احمدیہ
کی مخالفت کے غلامان محمد صلی اللہ علیہ وسلم اتنی تعداد میں نظر آتے ہیں۔
پھر قادیاں اور خلیفہ کا ذکر کر کے ملزم نے کہا کہ ہم سب کو ایک عزم یہاں لایا
ہے اور وہ یہ ہے کہ اس ناپاک زمین کو پاک کیا جائے۔ خدا اس زمین کو پاک کرے۔
کیونکہ یہاں خاتم النبیینؐ کی توہین ہوتی ہے۔ اس جگہ پیارے مدنی، مکی رسولؐ موجود
نہیں ہیں۔ یہاں شرک ہے اور یہاں چالیس کروڑ مسلمانوں کے تیرہ سو سالہ قبلہ کے
احترام کی ہتک کی جاتی ہے۔ میں ایک بات جانتا ہوں کہ خواہ کوئی شخص مکہ میں پیدا ہو

اور مکہ ہی میں مرے لیکن اگر اس نے رسولؐ سے محبت نہ رکھی تو اس کی نجات نہیں ہو سکتی۔ میں غریب ہوں اور اپنے دلی خیال کا اظہار کرتا ہوں۔ حکومت کو یاد رکھنا چاہیے کہ جو شخص نبوّت کی قمیص تک نہیں چھوڑتا ہم اس کے لیے طاعون اور ہیضے کی طرح ہیں اگر حکومت کوئی اور ہاتھ دیکھنا چاہتی ہے تو اس کی مرضی۔"

تم نے ہمیں سینکڑوں بار آزمایا ہے۔ قبل ازیں خلافت اور مقامات مقدسہ کے احترام کا سوال اٹھا۔ رسول اکرمؐ کی عزت پر حملہ کیا گیا تو یہ احمدی خوشی کے مارے اچھل پڑے جب ملک کا سوال اٹھا، انہوں نے کہا کہ یہ (مرزائی) ہندوستان کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے ہیں اور صرف خدا کے رسول سے تعلق رکھتے ہیں۔ حکومت نے ہماری طاقت کو نہیں آزمایا۔ اب گیارہ بجے ہیں۔ سورج نکلنے میں ابھی سات گھنٹے باقی ہیں اور یہاں ہزاروں لوگ جمع ہیں۔ حکومت کو اپنی طاقت ہٹا لینی چاہیے۔

میں گورنمنٹ کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن اس شخص کا کیا حشر ہوگا جو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ ہمارے ساتھ کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ انگلستان والوں کے دم کٹے کتے ہیں اور انگریزوں کی چاپلوسی بھی کرتے ہیں اور ان کی جوتیوں کے تلے صاف کرتے ہیں۔ میں فخر نہیں کرتا اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اگر مجھے اکیلا چھوڑ دیا جائے تو تم میرے لئے بشیر کے معرکے دیکھو۔

میں کیا کہوں لفظ تبلیغ نے مجھے مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ یہ پولیٹیکل کانفرنس نہیں ہے۔ اگر باہیں ڈھیلی چھوڑ دی جائیں تو مرزائیو! میں تمہیں کہتا ہوں کہ تم پیشاب کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کبھی حکومت سے امداد حاصل نہیں کی۔ ان کی نبوت اور خلافت حکومت کے سہارے کھڑی ہے۔ تمہیں کیا پتہ پانچ سال کے عرصہ کے اندر اندر یہ پولیس ہمارے قبضہ میں ہوگی۔

پھر علماء سے جو اسٹیج پر بیٹھے تھے ملزم نے مخاطب ہو کر پوچھا کہ آیا جو شخص پانچویں جماعت میں فیل ہو جائے وہ نبی بن سکتا ہے؟ ہندوستان میں تو اس کی ایک مثال موجود ہے کہ ایک شخص نے فیل ہو کر نبی کا دعویٰ کیا۔

پھر ملزم نے کہا کہ حدیث اور تفسیر سے ثابت ہے کہ مرزا غلام احمد نبی نہیں تھا اور کہ نبی دھوکے باز نہیں ہوتا۔ پھر اب دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی ہے۔ غریب شاہ کو مارا گیا۔ محمد امین کو قتل کیا گیا۔

او مسیح کی بھیڑو! تم سے نپٹنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ ہاں اب تمہارا مجلسِ احرار سے مقابلہ ہے۔ اس نے تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔ یہ مرزائی ہر جگہ ایک ہی ہیں انگریز اگر مکہ پر بھی قبضہ کر لے تو یہ وہاں بھی ان کی امداد کریں گے۔ او مرزائیو! یہ تمہاری نبوت کی تصویر ہے اور یہ حکومت سے مخفی نہیں ہے۔ تم اس کی دیر تک خدمت کرتے رہے ہو اور تم اس کے ناصح اور خیر خواہ ہو۔

یہ ہندوستانی نبی ڈپٹی کمشنر کے پاس جا جا کر کہتا ہے کہ میں نے اور میرے باپ نے حکومت کی بڑی خدمتیں کی ہیں۔ او خبیث! اگر تم نبی ہو گئے تھے تو تمہیں اپنا وقار قائم رکھنا چاہیے تھا۔

ملزم نے ایک جھوٹے مدعی کی مثال بیان کی جس نے شہنشاہ عالمگیر کو گمراہ کیا تھا اور کہا اگر نبوت ہی کا دعویٰ تھا تو پھر تمہیں انگریزوں کا کتا نہیں بننا چاہیے تھا۔ تُف ہے اور لاکھ لعنت ہے اس نبوت پر۔ کتاب "آئینہ کمالات" کا ذکر کر کے ملزم نے کہا۔ مرزا غلام احمد نے لکھا ہے کہ وہ جو مجھے نہیں مانتا حرامی ہے!

میں حکومت سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور حکومت کو جواب دینا ہوگا۔ اگر ایسا ہی کوئی لفظ "زمیندار، احسان، سیاست، احرار" میں چھپ جائے تو یہ تمام اخبارات ضبط ہو جائیں گے لیکن یہ مرزائی حرامی کا لفظ استعمال کریں تو کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا۔

"نوراسلام" میں بھی جو مرزا غلام احمد کی لکھی ہوئی کتاب ہے کہتا ہے کہ مرزا غلام احمد کے مخالفین جو اس پر ایمان نہیں رکھتے سور (خنزیر) ہیں اور ان کی بیویاں کتیاں ہیں۔

تقریر ختم کرنے سے پہلے ملزم نے حکام کو مخاطب کر کے کہا کہ کانفرنس کے انعقاد سے ہماری غرض لڑائی نہیں بلکہ اس علاقے کے مظلوم مسلمانوں کا بچاؤ ہے۔ پھر سامعین کو یاد دلایا کہ مرزائی دفعہ ۴۴ا تعزیرات ہند کے نافذ کرا لینے پر بھی شرمندہ نہیں ہیں۔

فیصلہ میں ملزم کو زیر دفعہ ۱۵۳ا تعزیرات ہند حضور ملک معظم کی رعیت کے دو فرقوں میں یعنی احمدیوں اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان نفرت ڈلوانے کے الزام میں مجرم قرار دیتا ہوں۔ فیصلہ کے متعلق اس بات کا پورا احساس رکھتے ہوئے کہ یہ تقریر ایک تبلیغی کانفرنس میں ہوئی تھی میں سمجھتا ہوں کہ چھ ماہ قید بامشقت اس کے لیے کافی ہوگی پس میں ملزم کو چھ ماہ قید بامشقت سزا دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ بی کلاس کے قیدیوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔

دستخط سکھانند

مجسٹریٹ درجہ اول گورداسپور مورخہ $\frac{4}{25}$ ۲۰

سیشن کورٹ میں اپیل ماتحت عدالت کے فیصلہ کے خلاف سیشن کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ ابتدائی سماعت میں امیر شریعت ضمانت پر رہا کر دیے گئے۔

مقدمہ کی پیروی کے لیے بخاری ڈیفنس کونسل قائم ہوئی جو چار وکلاء پر مشتمل تھی۔

۱۔ مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ ۲۔ شیخ شریف حسین پلیڈر

۳۔ شیخ چراغ الدین (جو بعد میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے)

۴۔ لالہ پشاوری مل ایڈووکیٹ۔

مرزائیوں کی جانب سے چوہدری سر ظفر اللہ خاں اور ان کے بھائی چوہدری اسد اللہ خاں پیروکار تھے۔

اپیل کا فیصلہ مسٹر جی۔ ڈی۔ کھوسلہ سیشن جج گورداسپور نے فریقین کے وکلاء کی بحث کے بعد حسب ذیل فیصلہ دیا۔

"اپیلانٹ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ ا کے تحت مجرم قرار دیتے ہوئے ۶ ماہ قید بامشقت کی سزا اس تقریر کی بنا پر دی گئی ہے جو اس نے احرار تبلیغ کانفرنس کے موقع پر ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو کی تھی۔"

اپیلانٹ کے خلاف فرد جرم پر نظر ڈالنے سے پہلے چند واقعات کا بیان کرنا ضروری ہے، جو معاملہ زیر بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقریباً پچاس برس کا عرصہ ہوا قادیان کے ایک شخص مسمی غلام احمد نے دنیا کو اعلان کیا کہ وہ مسیح موعود ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی اس نے اسلام کے اعلیٰ پادری کی حیثیت اختیار کر لی جس کے ارکان اگرچہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ان کے بعض عقائد اور اصول اسلام کے عام مسلمہ اصولوں سے بالکل متضاد تھے۔ اس فرقے کا جو قادیانی، مرزائی یا احمدی کہلاتا ہے امتیازی نشان یہ ہے کہ اس کے ارکان اس فرقے کے بانی کی (جسے مرزا کہا جاتا ہے) نبوت پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں۔ جو تحریک اس طرح شروع کی گئی اس نے جلد ہی شکل پکڑی اور آہستہ آہستہ لیکن غیر مشتبہ طور پر بڑھنا شروع کیا اور اس کے پیرو چند ہزار کی تعداد میں ہو گئے۔ قدرتاً کچھ مخالفت ہوئی اور مسلمانوں کی اکثریت بانیٔ فرقہ کی مذہبی فوقیت کے گھمنڈ سے سخت ناراض ہوئی۔ مذہب کے مخالفوں نے "کافر" کے الزام کا جو مرزا نے ان پر لگایا شدت سے جواب دیا۔ مگر قادیانیوں نے اس بیرونی تنقید کا بالکل خیال نہ کیا اور اپنے وطن قادیان میں مقامی طور پر محفوظ ہونے ہوئے جہاں تک ہو سکا حالات کے مطابق خوشحال رہے۔

مقابلتاً محفوظ ہونے کی اس حالت نے غرور پیدا کر دیا جس نے قادیانیوں میں تمرّد کی شکل اختیار کر لی۔ اپنے دلائل کو منوانے اور فرقے کو ترقی دینے کے لیے انہوں نے

ان ہتھیاروں کا استعمال شروع کیا جن کو عام طور پر نہایت ناپسندیدہ کہا جائے گا۔ انہوں نے ان اشخاص کے دلوں میں جنہوں نے ان کی جماعت میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ نہ صرف بائیکاٹ، اخراج اور بعض اوقات اس سے بھی بدتر مصائب کی دھمکیوں سے دہشت انگیزی پیدا کی۔ بلکہ اکثر انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا کر اپنے تبلیغی سلسلے کو مضبوط کیا۔ قادیاں میں ایک والنٹیر کور مقرر کی گئی۔ جس کا منشا غالباً اپنے احکام کو منوانے کے لیے قوت پیدا کرنا تھا۔ انہوں نے عدالتی اختیارات کا استعمال بھی اپنے ذمے لے لیا۔ دیوانی مقدمات میں ڈگریاں صادر کی گئیں اور اجراء بھی کرایا گیا۔ فوجداری مقدمات میں سزا کے حکم سنائے گئے اور سزائیں بھی دی گئیں۔ لوگوں کو فی الحقیقت قادیان سے نکال دیا گیا۔ قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ قادیانیوں پر صریح الزام لگایا گیا کہ انہوں نے مکانوں کو تباہ کیا، جلایا اور قتل بھی کیے گئے۔

اس خیال سے کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ مذکورہ بالا واقعات محض احرار کے تخیل کی ایجاد ہیں یہ لازمی ہے کہ میں چند واقعی مثالیں بیان کردوں جو اس مقدمے کی مسل پر لائی گئیں۔

کم از کم دو اشخاص کو اپنے وطن قادیان سے باہر نکالا گیا۔ کیونکہ ان کے خیالات مرزا کے خیالات سے متفق نہ تھے۔ وہ اشخاص حبیب الرحمٰن نمبر ۲۰ اور اسمٰعیل ہیں۔ مسل پر ایک چٹھی ڈی۔ زیڈ نمبر ۲۲ موجود ہے جس کا کاتب خود موجودہ مرزا ہے اور جس میں یہ حکم دیا گیا کہ حبیب الرحمٰن گواہ صفائی نمبر ۲۰ کو قادیاں میں آنے کی اجازت نہیں۔ اس چٹھی کو مرزا بشیر الدین محمود گواہ نمبر ۲۰ نے تسلیم کیا ہے۔ گواہ صفائی نمبر ۲۰ (خانصاحب فرزند علی) نے تسلیم کیا ہے کہ اسمٰعیل کو جماعت سے خارج کیا گیا اور قادیان میں داخل نہ ہونے کا حکم دیا گیا۔ بہت سے دیگر گواہوں نے تشدد اور ظلم کی داستانیں بیان کی ہیں۔ بھگت سنگھ گواہ نمبر ۴۹ بیان کرتا ہے کہ مرزائیوں نے اس پر حملہ کیا۔ ایک شخص غریب شاہ کو قادیانیوں

نے مارا اور جب اس نے دعویٰ کرنا چاہا تو کوئی شخص اس کی شہادت دینے کے لیے آگے نہ آیا۔ قادیانی ججوں کے فیصلہ شدہ مقدمات کی مسلیں پیش کی گئیں جو مسل میں موجود ہیں۔ مرزا نے تسلیم کیا ہے کہ عدالتی اختیارات قادیان میں استعمال کیے جاتے ہیں اور ان معاملات میں وہ خود آخری عدالت اپیل ہے۔ عدالت کی ڈگریوں کا اجرا کیا جاتا ہے اور ایک مثال بھی موجود ہے۔ جہاں ڈگری کے اجرا میں ایک مکان کو نیلام کیا گیا۔ قادیاں میں ایک والنٹیر کور کی موجودگی کی شہادت گواہ صفائی نمبر۱۴ (مرزا شریف احمد) نے دی ہے۔[1]

علاوہ ازیں سب سے سنگین معاملہ عبدالکریم کا ہے۔ جس کی داستان حقیقتاً ایک داستانِ درد ہے۔ اس شخص نے مرزائی مذہب قبول کیا اور قادیان چلا گیا۔ مگر وہاں اس کے دل میں مذہبی شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور اس نے مرزائیت سے توبہ کر لی۔ تب اس پر ستم آرائی کی ابتداء ہوئی۔ اس نے ایک اخبار "مباہلہ" نامی جاری کیا، جس کا مقصد مرزائی جماعت کے اعتقادات پر تنقید کرنا تھا۔ مرزا نے ایک تقریر میں جو دستاویز ڈی زیڈ نمبر ۹۳ (الفضل مورخہ ۴/۳۰ ا) میں شائع ہوئی ہے۔ اس تقریر میں ان لوگوں کی طرف اشارہ بھی کیا جو اپنے مذہب کی خاطر قتل کرنے کو بھی تیار ہوتے ہیں۔ اس تقریر کے فوراً بعد عبدالکریم پر قاتلانہ حملہ ہوا لیکن وہ بچ گیا۔ ایک شخص محمد حسین عبدالکریم کی امداد کرتا تھا اور ایک فوجداری مقدمہ میں جو عبدالکریم کے خلاف چل رہا تھا اس کا ضامن تھا۔ اس پر فی الحقیقت حملہ ہوا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ قاتل پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا ہوئی۔

پھانسی کے حکم کی تعمیل ہوئی اور پھانسی کے بعد لاش قادیانی لائی گئی اور اس کو

---

[1] مرزا کو جو عرضیاں دی جاتی ہیں۔ ان پر قادیانی ساخت کا اسٹامپ اور کورٹ فیس تیار کر کے فروخت اور استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ سب پوشیدہ طور پر کیا جاتا ہے۔

دھوم دھام سے اسے اس جگہ دفن کیا گیا جس کا نام "بہشتی مقبرہ" ہے۔ الفضل اخبار میں جو مرزائی جماعت کا اخبار ہے قتل کی تعریف اور قاتل کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ لکھا گیا ہے کہ قاتل مجرم نہیں تھا اور امر واقع سے قبل ہی جان دے کر پھانسی کی بدنام کنندہ سزا سے بچ گیا۔ خدا نے اپنے عدل و انصاف میں یہ مناسب سمجھا کہ پھانسی کی ذلت سے پہلے ہی اس کی روح قبض کر لے۔

جب عدالت میں مرزا کا ایک معاملے کے متعلق بیان لیا گیا تو اس نے بالکل مختلف کہانی بیان کی اور کہا کہ محمد حسین کے قاتل کو باعزت طریق پر اس لیے دفن کیا گیا تھا کہ اس نے اپنے جرم پر اظہار ندامت کیا تھا اور اس طرح گناہ سے بری ہو گیا تھا لیکن دستاویز ڈی زیڈ نمبر ۴۰ اس کی تردید کرتی ہے اور مرزا کی نیت اور اس کی دلی کیفیت کا پتہ اس اظہار خیال سے بالکل عیاں ہے۔ (ڈی زیڈ نمبر ۴۰)

میں یہاں یہ بھی کہہ دوں کہ اس دستاویز کا مضمون لاہور ہائی کورٹ کی توہین بھی ہے۔

ایک اور واقعہ بھی ہے جو محمد امین کے قتل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ محمد امین بھی مرزائی تھا اور یہ امر واقعہ ہے کہ وہ اس فرقے کا ایک مبلغ تھا اس کو بخارا بھیجا گیا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے اس کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اس کی موت کلہاڑی کی ایک ضرب سے ہوئی جو چوہدری فتح محمد گواہ صفائی ۱۲ نے لگائی۔ عدالت ماتحت نے اس معاملے کو سرسری نظر سے دیکھا ہے لیکن اس پر نظر غائر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ محمد امین اگرچہ مرزائی تھا لیکن وہ مرزا کا مورد عتاب ہو چکا تھا۔ اس لیے ہستی بزرگ نہیں رہا تھا۔ اس کی موت کے واقعات کچھ ہی ہوں یہ امر ناقابل انکار ہے کہ محمد امین تشدد کی موت مرا۔ پولیس کو واقعے کی اطلاع دی گئی لیکن بالکل کارروائی نہ کی گئی۔ یہ بحث کرنا فضول ہے کہ قاتل حفاظت خود اختیاری کر رہا تھا کیونکہ یہ فیصلہ تو اس عدالت کا کام ہے جو مقدمے کی سماعت کرے۔ یہ امر کافی تعجب انگیز ہے کہ چوہدری فتح محمد

نے بنا اقرار صالح بیان دیا ہے کہ اس نے محمد امین کو قتل کیا تھا مگر پولیس کچھ نہ کر سکی اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ مرزائی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ کوئی گواہ سامنے آکر سچ بولنے کو تیار نہیں تھا۔ ہمارے سامنے عبدالکریم کے مکان کا معاملہ بھی ہے۔ عبدالکریم کو قادیان سے نکالنے کے بعد اس کا مکان جلا دیا گیا۔ اسے قادیان کی سمال ٹاؤن کمیٹی سے حکم حاصل کر کے نیم قانونی طریقے سے گرانے کی کوشش بھی کی گئی۔

یہ افسوسناک واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ قادیان میں طوائف الملوکی تھی جس میں آتش زنی اور قتل بھی ہوتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکام ایک غیر معمولی درجے کے فالج کا شکار ہو چکے ہیں اور دنیوی اور دینی معاملات میں مرزا کے حکم کے خلاف کبھی آواز نہ اٹھائی گئی۔ مقامی افسروں کے پاس کئی مرتبہ شکایات کی گئیں لیکن انسداد نہ ہوا۔ مسل پر ایک دو ایسی شکایات ہیں لیکن ان کا حوالہ دینا غیر ضروری ہے اور اس مقدمے کے اغراض کے لیے یہ بیان کر دینا کافی ہے کہ قادیان میں ظلم و جور جاری ہونے کے متعلق غیر مشتبہ الزامات عائد کیے گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی گئی۔

ان کارروائیوں کے سدِّ باب کے لیے مسلمانوں کے اندر منتقدانہ روح حیات پیدا کرنے کے لیے احرار تبلیغ کانفرنس بلائی گئی۔ قادیانیوں نے قدرتاً اس اقدام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور انہوں نے کانفرنس کے انعقاد کو کلیتہً روکنے کے لیے دلیرانہ کوشش کی۔ احرار کانفرنس کے انعقاد کے لیے ایک شخص ایشر سنگھ کی زمین حاصل کی گئی تھی۔ قادیانیوں نے اس زمین پر قبضہ کر لیا اور اس پر دیوار کھینچ دی۔ اس طرح ایک ہی قطعہ زمین سے بھی محروم کر دیے گئے جو ان کو قادیان میں حاصل ہو سکتا تھا اور اس لیے مجبور کر دیے گئے کہ قادیان سے ایک میل کے فاصلے پر ایک جگہ اپنا اجلاس کریں۔ دیوار کا بنایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت فریقین میں تعلقات کس قدر کشیدہ تھے۔

اور مرزائیوں کا تمرّد کس حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ اپنی دست درازی کے قانونی انجام سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ و مامون سمجھتے تھے۔

لیکن اجلاس ہوا اور یہی اجلاس تھا جس کے لیے اپیلانٹ کو کہا گیا جو بے انداز مقناطیسی جذب اور اعلیٰ درجے کی فصیحانہ خطابت کا مالک ہے۔ اُس نے اس اجلاس میں وہ تقریر کی جسے دلولہ انگیز خطاب کہا جا سکتا ہے۔ تقریر کئی گھنٹے جاری رہی اور بیان کیا گیا ہے کہ حاضرین کی یہ کیفیت کہ گویا مسحور ہیں۔ اس تقریر میں اپیلانٹ نے اپنے خیالات کا اظہار کس قدر صاف گوئی سے کیا اور اس نے اس بات کو پوشیدہ نہ رکھا کہ اس کے دل میں مرزا اور اس کے پیروؤں کے خلاف کس قدر ناپسندیدگی بلکہ نفرت ہے تقریر اخبارات میں شائع ہوئی اور اس پر اعتراض کیا گیا۔ معاملہ حکومت پنجاب کے سامنے پیش ہوا جس نے موجودہ مقدمہ کی اجازت دی۔

اپیلانٹ کے خلاف جو فردِ جرم ہے اس میں اس کی تقریر کے سات حصے درج ہیں جن کو خاص طور پر قابلِ اعتراض اور قابلِ گرفت بتایا گیا ہے۔ وہ حصے یہ ہیں۔

"فرعونی تخت الٹا جا رہا ہے انشاء اللہ یہ تخت نہیں رہے گا۔ وہ نبی کا بیٹا ہے، میں نبی کا نواسا ہوں۔ وہ آئے تم سب چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ وہ مجھ سے اردو، فارسی، پنجابی میں ہر معاملے پر بحث کرلے۔ یہ جھگڑا آج ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ پردے سے باہر آئے۔ نقاب اٹھائے۔ کشتی لڑے۔ مولا علیؓ کے جوہر دیکھے۔ وہ ہر رنگ میں آئے۔ وہ موٹر میں بیٹھ کر آئے میں ننگے پاؤں آؤں۔ وہ ریشم پہن کر آئے میں کھدر کا کرتا۔ وہ زعفران، کباب، یاقوتیاں اور پلومر کی ٹانک اپنے ابا کی سنت کے مطابق کھا کر آئے میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی کھا کر آؤں۔ یہ ہمارا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ برطانیہ کے دُم کٹے کتے ہیں۔

وہ خوشامد میں برطانیہ کے بوٹ کی ٹو صاف کرتا ہے۔ میں تکبر سے نہیں کہتا بلکہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ پھر بشیر کے اور میرے ہاتھ دیکھو۔ کیا کروں لفظ تبلیغ نے ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ یہ سیاسی مجلس نہیں ہے۔ او مرزائیو! اگر باگیں ڈھیلی ہوتیں۔ میں کہتا ہوں کہ اب بھی ہوش میں آؤ۔ تمہاری طاقت اتنی بھی نہیں جتنی پیشاب کی جھاگ ہوتی ہے۔

جو پانچویں جماعت میں فیل ہوتے ہیں، نبی بن جاتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں ایک مثال موجود ہے۔ جو فیل ہوا وہ نبی بن گیا۔ او مسیح کی بھیڑو! تم سے کسی کا ٹکراؤ نہیں ہوا۔ جس سے اب مقابلہ پڑا ہے یہ مجلس احرار ہے۔ اس نے تم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے۔

او مرزائیو! اپنی نبوت کا نقشہ دیکھو۔ اگر تم نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو نبوت کی شان تو رکھتے۔

اگر تم نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ تو انگریزوں کے کتے نہ بنتے۔"

اپیلانٹ نے عدالت ماتحت میں بیان کیا کہ اس کی تقریر درست طور پر نہیں لکھی گئی۔ اس نے جملہ نمبر ۵ کے متعلق خاص طور پر کہا کہ وہ اس کا کہا ہوا نہیں ہے۔ اگرچہ اس نے تسلیم کیا کہ باقی جملوں کا مضمون میرا ہے لیکن اس نے عبارت کے غلط ہونے کا عذر اٹھایا۔ عدالت ماتحت کے فیصلے پر کہ جملہ نمبر ۵ کی رپورٹ غلط ہے اور اپیلانٹ کو اس کے متعلق مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اپیلانٹ کی سزایابی باقی چھ فقروں پہ مدار رکھتی ہے۔ اپیلانٹ کے وکیل نے بحث کے وقت فوراً تسلیم کیا کہ فقرہ جات نمبر ۱ تا نمبر ۴ اور نمبر ۵ تا نمبر ۷ فی الحقیقت اپیلانٹ نے کہے۔ وہ اس مرحلے پر رپورٹر کی عبارت کی درستگی کو بھی زیر بحث نہیں لانا چاہتا۔ اس لیے میرے واسطے یہی امر قابل فیصلہ ہے

کہ آیا یہ چھ جملے زیر دفعہ ۱۵۳ الف قابلِ گرفت ہیں اور کیا یہ الفاظ کہہ کر مرافعہ گزار نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

"مرافعہ گزار نے عدالت میں بہت سی تحریری شہادتیں پیش کیں اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس کی تقریر کا مقصد مرزا اور اس کے متبعین کے جبر و تشدد اور ستم رانیوں پر جائز اور معقول تنقید کرنا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس کی تقریر کا واحد مقصد سوئے ہوئے مسلمانوں کو دعوت بیداری دینا اور مرزائیوں کے مذموم افعال کا راز طشت از بام کرنا تھا۔"

اس نے اپنی تقریر میں جا بجا مرزا کے ظلم و تشدد کا ذکر کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ ان مسلمانوں کی شکایات کا ازالہ کرایا جائے جو صرف مرزا کی نبوت اور اس کے خود ساختہ اقتدار کے منکر ہونے کی وجہ سے ہدفِ جور و ستم بنے ہوئے ہیں۔

میں نے مرافعہ گزار کی تقریر پر ان حالات کی روشنی میں غور کیا ہے جو قادیاں میں رونما ہو رہے تھے۔ اوّل یہ کہ وہ مرزا اور اس کے متبعین کے افعال پر تنقید کرے دوم یہ کہ مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دینا چاہتا تھا کہ وہ مرزائیوں کے مقابلے میں بیدار ہو کر اپنی شکایات کے ازالہ کی کوئی صورت نکالیں۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ تقریر مسلمانوں کی طرف سے صلح کا ایک اعلان تھی۔ لیکن اسے سرسری طور پر پڑھنے سے کوئی معقول آدمی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اعلانِ صلح کی بجائے یہ تقریر پیکار آزمائی کی دعوت تھی۔ مرافعہ گزار نے قانون کے اندر رہنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی ہو لیکن اپنی لسانیت اور جوشِ فصاحت میں وہ قانون کی امتناعی حدود کو پھاند گیا اور اس نے ایسی باتیں کہہ دیں جو اس کے سامعین کے دلوں میں مرزائیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے سوا اور کوئی اثر نہیں کر سکتی تھیں ایک پختہ کار مقرر کی طرح مرافعہ گزار نے روما کے مارک انٹونی کی سنّت پر عمل کرتے

ہوئے یہ اعلان تو کر دیا کہ وہ احمدیوں سے برسرِ پیکار نہیں ہونا چاہتا لیکن صلح و اتحاد کا یہ اعلان ایسی سخت کلامی سے مملو تھا جس کا مقصد سامعین کے دل میں احمدیوں کے خلاف منافرت و حقارت پیدا کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مرافعہ گزار کی تنقیدیں ایسے حصے بھی ہیں جو مرزا کے افعال کی جائز اور معقول تنقید پر مبنی ہیں۔ تقریر کے دوران غریب شاہ کو زدوکوب کرنے کا واقعہ، محمد حسین اور محمد امین کے واقعات قتل اور مرزائے قادیان کے جبر و تشدد کے متعدد ایسے واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے جن پر تنقید کرنے کا ہر سچے مسلمان کو حق ہے۔ نیز اس تقریر کے دوران اس توہین کا بھی ذکر کیا گیا جو احمدی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں روا رکھتے ہیں اور جن سے لازمی طور پر مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے نزدیک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم النبیین ہیں۔ لیکن مرزائیوں کا عقیدہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد بھی کئی نبی آ سکتے ہیں اور ان پر وحی نازل ہو سکتی ہے اور یہ کہ مرزائیہ فرقہ کا بانی نبی اور مسیح موعود تھا۔ اس حد تک مرافعہ گزار کی تقریر قانون کی زد سے باہر ہے لیکن جب وہ سخت کلامی سے کام لیتا ہے اور مرزائیوں کو ایسے ایسے فارمولا سے خطاب کرتا ہے جنہیں سننا کوئی معقول آدمی گوارا نہیں کر سکتا تو وہ جائز اور معقول تقریر کی حدوں کو پھاند جاتا ہے اور خواہ اس نے یہ باتیں دیدہ و دانستہ کہیں یا جذبات کے جوش میں قانون ان سے اغماض نہیں برت سکتا۔

مرافعہ گزار کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس کے سامعین کی اکثریت ناخواندہ دیہاتیوں پر مشتمل ہے اور یہ کہ اس قسم کی تقریر ان کے دل میں احمدیوں کے خلاف بغض و عناد کے جذبات کی پرورش کرے گی۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ تقریر نے سامعین پر مزعومہ اثر ڈالا اور مقرر کی لسانیت سے مسحور ہو کر لوگوں نے متعدد دفعہ جوش کا مظاہرہ کیا۔ یہاں اس امر پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ سامعین نے اس وقت اپنے مخالفین

کے خلاف متشدّدانہ اقدام کیوں نہ کیا اس تقریر نے نفرت کو کچھ زیادہ ہی کر دیا۔
فردِ جرم میں جن سات حصوں کو قابل گرفت ٹھہرایا گیا میرے نزدیک ان میں سے تیسرا اور ساتواں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض حصے ہیں۔ ان فقروں میں مرافعہ گزار نے احمدیوں کو برطانیہ کے دم بریدہ کتے کہا ہے۔ میرے نزدیک دوسرے حصے تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ الف کے ماتحت قابل گرفت نہیں ہیں۔
پہلا حصہ یعنی فرعونی تخت اٹھا جا رہا ہے میرے نزدیک بالکل بے ضرر ہے۔ دوسرا حصہ مرزا کی خوراک کے متعلق ہے۔ یہ امر قابل دلچسپی ہے کہ مرزائے اوّل نے اپنے عقیدت مندوں میں سے ایک کے نام خط لکھا تھا جس میں خوراک کی ایسی تمام تفصیلات موجود تھیں۔ یہ خطوط کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کا ایک نسخہ اس مقدمے کے کاغذات میں شامل ہے۔
میری رائے میں تیسرے اور ساتویں حصے کے سوا اور کوئی حصہ قابل گرفت نہیں۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ مرافعہ گزار کی تقریر میں صرف دو حصے ہی قابل اعتراض ہیں تقریر کے کوائف سے پتہ چلتا ہے کہ مرافعہ گزار کا مقصد جہاں احمدیوں کے افعالِ شنیعہ کا تار پود بکھیرنا تھا وہاں مسلمانوں کے دل میں ان کے خلاف جذبات حقارت پیدا کرنا بھی تھا۔ یہ امر کہ سامعین نے اس کی تقریر سے متاثر ہو کر تشدّد اور امن شکنی کا مظاہرہ کیوں نہ کیا۔ اس کے جرم میں صرف تخفیف کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔
مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مرافعہ گزار احمدیوں پر تنقید کرنے میں حق بجانب تھا۔ تاہم میرے خیال میں اس نے قانون کی حدیں توڑ دیں۔ اگرچہ مرافعہ گزار نے اصطلاحی جرم کا ارتکاب کیا ہے تو بھی قانون کی ہمہ گیری کا تحفظ ضروری معلوم ہوتا ہے۔
اس مقدمے کے تمام پہلو پر غور کرنے اور سامعین پر اس تقریر کے اثرات کا اندازہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مرافعہ گزار نے تعزیرات ہند کی دفعہ

۱۵۳ و کے ماتحت ارتکاب جرم کیا ہے اور اس کے جرم کو قائم رہنا چاہیے۔ سزا کی کمی اور بیشی کا اندازہ کرتے وقت یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو قادیان میں رونما ہو رہے تھے۔ چنانچہ میں اس کی سزا میں تخفیف کرتے ہوئے اسے تا اختتام عدالت قید محض کی سزا دیتا ہوں۔

دستخط

۶۔ جون ۱۹۳۵ء جی۔ ڈی۔ کھوسلہ سیشن جج۔ گورداسپور

تقریر امرتسر

ماتحت عدالت گورداسپور میں ابھی مقدمہ زیر سماعت تھا کہ امیر شریعت نے امرتسر میں ۲۴۔ اپریل ۱۹۳۵ء کو رات نو بجے مسجد خیر الدین میں مولانا عبد الغفار غزنوی کی زیر صدارت تقریر کرتے ہوئے کہا

"بعض ناعاقبت اندیش لوگ کہتے ہیں کہ مرزائیت کے ساتھ ہمارے شیعہ، سنی اور وہابی کی طرح کے فروعی اختلافات ہیں اور اسی سلسلے میں گورنر بہادر انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں مسلمانوں کو اتحاد اور اتفاق کی تعلیم دے چکے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان کے لیے اپنے خود کاشتہ پودے کی مخالفت ناقابل برداشت ہے۔ ہم انشاء اللہ اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر رہیں گے۔

مرزائیت کے وجود میں آنے کی وجہ یہ ہے کہ تیرہ سو سال سے عیسائیت کے جگر میں ایک کانٹا تھا جو کسی طرح نکلنے میں نہیں آتا تھا۔ وہ کانٹا یہ تھا کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحدت ملی یا مرکزیت عطا ہوئی تھی یہ دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھی۔ عیسائیت چاہتی تھی کہ اسلام کی اس وحدت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کی بربادی کے لیے پنجاب میں مرزا غلام احمد قادیانی کو کھڑا کیا گیا۔ اور اس نے ایڑی چوٹی کا

زور وحدتِ ملی کو تباہ کرنے میں لگایا۔ یہ اختلافات فروعی ہیں؟ کہ نبی کے مقابلے میں نبی کھڑا کر دیا گیا ہے اور مدینۃ النبیؐ کے مقابلہ میں مدینۃ المسیح اور جنت البقیع کے مقابلہ میں بہشتی مقبرہ بنایا گیا ہے۔

اس وقت ضرورت ہے کہ مرکزی شعبۂ تبلیغ مجلس احرار کو مضبوط کیا جائے محلہ محلہ شعبہ ہائے تبلیغ قائم کر دیے جائیں اور قادیان میں زمین اور جائداد خریدی جائے۔ جس دن ہمارا اپنا ہائی سکول، اپنا تبلیغی کالج، اپنی مسجد اور مہمان خانہ قادیان میں تیار ہو گیا، سمجھو کہ مرزائیت کا خاتمہ ہو گیا۔

مرزا بشیر الدین نے پیش گوئی کی تھی کہ ۶ ماہ کے بعد احرار کا کام ختم ہو جائے گا۔ اور یہ لوگ ٹھنڈے پڑ جائیں گے مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا کام اب شروع ہوا ہے۔

قادیان کانفرنس کے خطبے کی بناء پر جس دفعہ ۱۵۳ اے کے تحت مجھے گرفتار کیا گیا ہے اس کی سزا زیادہ سے زیادہ صرف دو سال ہے۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم ہوں۔ اس جرم میں یہ سزا بالکل کم ہے۔ میں خاتم الانبیاءؐ کے ناموس پر ایسی ہزار جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے شیروں اور چیتوں سے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا جائے اور پھر کہا جائے کہ تمہیں بجرم عشق محمدؐ تکلیف دی جا رہی ہے تو میں خندہ پیشانی سے اس سزا کو قبول کروں گا۔ میرا آٹھ سالہ بچہ عطاء المنعم اور اس جیسے، خدا کی قسم، ہزار بچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت پر سے نچھاور کر دوں۔"

زلزلہ کوئٹہ ۳۰۔ اور ۳۱۔ مئی ۱۹۳۵ء کی درمیانی رات جب کہ نظامِ کائنات محوِ خواب تھا اور صرف آسمان کے ستارے جاگ رہے تھے، کوئٹہ میں ایسا زلزلہ

آیا کہ بندگانِ خدا عذابِ الٰہی کے باعث نیند کے راستے موت کی پگڈنڈی پر سفر کرنے لگ پڑے۔ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ رات کو صبح کی آس لے کر سوئے تھے کہ زلزلے نے انہیں لاکھوں من ملبہ کے ڈھیر تلے دبا دیا۔ اس عظیم حادثہ میں ہزاروں انسان جان و مال سے محروم ہو گئے۔

یوں تو کوئٹہ زلزلہ کے حادثات کا عادی تھا لیکن انسانی تباہی کا یہ منظر اپنی نوعیت میں عظیم تر تھا۔ ان دنوں مجلس احرار کا آفتاب نصف النہار پر تھا، جس کی روشنی سے غیر ملکی سامراج کی آنکھیں بھی چندھیا رہی تھیں۔ مجلس احرار نے کوئٹہ سے دہلی تک اپنے ریلیف کیمپ کھول دیے۔ ہزاروں باوردی رضاکار مصیبت زدگان کی امداد کے لیے رات دن مصروف ہو گئے۔

مجلسِ احرار کی اس بے لوث خدمت سے متاثر ہو کر وائسرائے ہند نے احرار رہنماؤں کو دہلی آنے کی دعوت دی تاکہ انہیں ان خدمات کے صلے میں سرکاری سرٹیفکیٹ دیا جائے۔ وائسرائے کی اس دعوت پر جماعت میں قدرے اختلاف تھا۔ ورکنگ کمیٹی نے اپنے ایک غیر رسمی اجلاس میں اس دعوت پر غور کیا۔ اجلاس میں امیر شریعت بھی امرتسر سے پہنچ گئے۔ جب انہیں وائسرائے کی اس دعوت کا علم ہوا تو اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"ملک ہمارا ہے، نقصان بھی ہمارا ہی ہوا ہے۔ بھائی بھی ہمارے مرے ہیں۔ ان کی خدمت کرنا بطور انسان کے ہمارا فرض تھا، سو ہم نے جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کیا۔ اس میں وائسرائے کون ہے جو ہماری خدمات سے خوش ہو کر ہمیں سرٹیفکیٹ دے۔ ہم تو اپنے خدا سے انعام چاہتے ہیں۔ انگریز کا سرٹیفکیٹ ہمارے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اگر مجلس احرار نے کوئٹہ ریلیف کیمپ وائسرائے کو خوش کرنے

سکے لیے کھولا تھا تو پھر اس کی دعوت پر فوراً دہلی جانا چاہیے اور اگر
مصیبت زدگان کی امداد خدا کے لیے کی ہے تو پھر میری رائے میں
دوستوں کو اس قسم کے مشورے پر اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

امیرِ شریعت کی اس رائے کو ورکنگ کمیٹی نے پسند کیا اور وائسرائے کو اطلاع کر دی گئی کہ کوئٹہ ریلیف کیمپ کے سلسلے میں آپ کی دعوت کا شکریہ بعض مصروفیتوں کی بنا پر ہم ملاقات کے لیے نہیں آ سکتے۔

مسجد شاہ چراغ

بساطِ سیاست پر بیٹھنے والے کھلاڑی جب حالات و واقعات کی نبض پر انگلیاں رکھتے ہیں تو ان کے فکر کی دماغی نالیاں اُبھر کر حالات کے نقشے کو کچھ اس ترتیب سے لکیرتی ہیں کہ واقعات آپ سے آپ سلجھتے جاتے ہیں۔

جھوٹ اور فریب کا خوبصورت نام ہے "سیاست" اور سیاسیات میں اقتدار کے گھوڑے پر سفر کرنے والے لوگ عموماً اسی لباس سے آراستہ رہے ہیں۔

۱۹۳۵ء کے آئین نے ہندوستان کو جو رعایت دی، وقت کے دانشور کرگسوں کا لباس اتار کر حرام میں شاہین بن کر پرواز کرنے لگے، حالانکہ وہ شاہین کی طرح شکار کرنے کے عادی نہیں تھے۔ لیکن کرگسوں میں پرورش پانے والے جب بال و پر سنوار کر سامنے آئے، تو نگاہیں فریب کھا گئیں۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد میاں سر فضل حسین جب وائسرائے کی کونسل سے فارغ ہو کر پنجاب میں آئے تو ان دنوں سر سکندر حیات آئندہ انتخاب کے لیے دوسری سیاسی پارٹیوں کے علاوہ مجلس احرار سے بھی رشتہ گانٹھ رہے تھے۔ ان کی رائے میں مجلس احرار اس وقت ایسی جماعت تھی جو پنجاب کی سیاست پر غالب تھی۔

سر فضل حسین زیرک آدمی تھے، اور ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے عادی تھے۔ اس گٹھ جوڑ پر اپنے مستقبل کو روشن نہ پا کر حکومت سے سازش کر کے سر سکندر حیات خاں کو سٹیٹ بنک

آف انڈیا کا ڈپٹی گورنر بنا کر کلکتہ بھجوا دیا۔ راستے کی اب دوسری بڑی دیوار صرف مجلس احرار تھی، جس کے رضاکاروں کی سرخ وردیاں گرتے ہوئے فرنگی وقار کے اُفق پر پرچھائیاں ڈال رہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس دیوار کے گرانے کو سیاسی استادوں نے مسجد شہید گنج کا منصوبہ تیار کیا۔

سات اور آٹھ جولائی ۱۹۳۵ء کی درمیانی رات کو چند سکھ مزدوروں نے لنڈا بازار کی تاریخی مسجد "شہید گنج" کو بلا کسی وجہ کے گرانا شروع کر دیا ان دنوں پنجاب کا گورنر مسٹر ایمرسن تھا۔ یہی وہ انگریز آفیسر ہے جو ۱۹۲۴ء میں ملتان کا ڈپٹی کمشنر تھا، جس نے تعزیہ داری کے موقعہ پر ہندو مسلم فساد کرایا تھا) مسجد گرتے سے لاہور اور باقی پنجاب کی ساری فضا پھر سے مکدر ہو گئی، سیاسی اُستاد گھات میں تھے، اور مسجد کا تمام ملبہ مجلس احرار پر گرا دیا گیا۔ اس سارے کھیل تماشے کے پس منظر میں مولانا ظفر علی خاں اور سر فضل حسین کی سیاست کام کر رہی تھی۔

مجلس احرار نے اعلان کیا کہ مسجد گری نہیں گرائی گئی ہے، اور یہ سب الیکشن کی سیاسی تدبیریں ہیں۔ مگر انگریز، مرزائی اور رجعت پسند مسلمان اس تیز روی سے پنجاب کی سیاسی زندگی کو اپنے قبضے میں کر چکے تھے کہ وقت کی سب سے بڑی فعال جماعت (احرار) کو سنبھالا لینا دشوار ہو گیا۔ اس ہنگامہ آرائی میں امیر شریعتؒ نے لاہور شاہی مسجد میں تقریر کے دوران کہا:۔

"مسجد شہید گنج آج ہی سکھوں کے قبضے میں نہیں آئی، بلکہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی واقعات نے نئی کروٹ لی اور ۱۷۹۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ حکومت کے سنگھاسن پر براجمان ہوئے تو پنجاب کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ ایک ہزار برس تک اٹھارہ لاکھ مربع میل پر حکومت کرنے والی مسلمان قوم بھی ان کی غلامی میں چلی گئی۔

موجودہ مسجد شہید گنج جو کبھی مسجد عبداللہ خاں کے نام سے مشہور تھی، سکھوں کی غلامی میں جاکر اس نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا۔ یہ عبداللہ خاں شہزادہ دارا شکوہ کا خانساماں تھا۔ یاد رہے کہ خانساماں سے مراد انگریزی عہد کا کھانا پکانے والا نہیں، بلکہ اس دور میں خانساماں کے معنی "خانِ ساماں" یا "امیرِ ساماں" تھا۔ یعنی ساماں کی حفاظت کرنے والا تھا۔

آج الیکشن کی ضرورت نے انگریز پرست لوگوں کو مجبور کیا کہ مسجد گرا کر اور اس کے کھنڈرات کو سیڑھیاں بنا کر پنجاب اسمبلی میں جائیں۔ ان مسجد کے شیدائیوں سے پوچھو کہ کیا لاہور میں کوئی دوسری مسجد[1] نہیں جس میں آج کل سرکاری دفاتر قائم ہیں۔ اس کی بازیابی کے لیے تو آواز بلند ہوتی، مگر ایک ایسی مسجد کو گرا کر کونسل کی سیڑھیاں بنایا جا رہا ہے جس کے گرنے سے پنجاب ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں خون کی ندیاں بہہ جانے کا احتمال ہے۔"

یہ تقریر صرف آدھ گھنٹہ جاری رہی، اور امیر شریعتؒ کے اس فقرے سنے کہ کیا لاہور میں کوئی اور دوسری مسجد نہیں جس میں آج کل سرکاری دفاتر قائم ہیں، حکومت اور عوام کو گہری فکر میں ڈال دیا۔

مسجد شاہ چراغ کے متعلق رائے بہادر کنہیا لال اپنی کتاب "تاریخ لاہور" میں لکھتے ہیں:۔

"محلہ سید چراغ شاہ، محلہ موج دریا بخاری کے مشرقی جانب واقع تھا۔ سادات گیلانی اس میں سکونت رکھتے تھے۔ یہ محلہ شاہ جہانگیر کے عہد میں آباد ہوا، اور مدت تک آباد رہا۔ آخر بے انتظامی کے باعث سکھ

---

[1] ۔ امیر شریعتؒ کا یہ اشارہ مسجد شاہ چراغ کی طرف تھا جس میں ان دنوں سرکاری دفتر تھا

غارتگروں نے اس کو ویران کر دیا۔
سید چراغ شاہ کا مقبرہ مسجد پختہ اب تک موجود ہے، مسجد تو سرکاری قبضے میں ہے اور اس میں اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر ہے۔"

حکومتِ پنجاب نے یہ سوچ کر کہ شہید گنج کی مٹی جو سکھ مزدوروں کے ہاتھوں اڑی اور مجلس احرار کے دامن سے لپٹ گئی، ایسا نہ ہو کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی اس تقریر کے بعد مسجد شاہ چراغ کی اینٹیں حکومت کو بھی زخمی کر دیں، چنانچہ تقریر کے دوسرے ہی دن اخبارات میں یہ خبر جلی عنوان سے شائع ہوئی، کہ

"حکومت نے مسجد شاہ چراغ مسلمانوں کو واگزار کر دی ہے اور اس کا انتظام انجمن اسلامیہ کے سپرد کر دیا ہے۔"

قتل کی سازش

پھول جب اپنی بہار چھوڑ دیتا ہے، تو نسیمِ سحرگاہی کا ایک ہی جھونکا اسے شاخ سے علیحدہ کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

جو قومیں حصولِ زندگی کے سانچے اپنی تن آسانی کے ہاتھوں توڑ دیتی ہیں، پھر انہیں اپنے مستقبل کے راستے اندھیرے دکھائی دیتے ہیں۔

ایکٹ ۱۹۲۵ء کے تحت انتخاب کی ضرورت نے مسلمان قوم سے وہ شعور چھین لیا، جس سے امتیاز کی دیوار قائم تھی، اور اپنے پرائے کے درمیان نشان دہی کی جا سکتی تھی۔ سیاسی شعبدہ بازوں نے اچھی بھلی قوم کو فکر کی تمام صلاحیتوں سے بیگانہ کر دیا، اور ایسے سبز باغ دکھائے کہ اپنے پرائے میں امتیاز مشکل ہو گیا۔ مسجد شہید گنج کی ہر اینٹ مجلس احرار کے دفتر کی طرف اٹھنے لگی۔ سیاست کے کھلاڑی مہروں کو اس انداز سے حرکت دیتے کہ بساط کی ساری بازی انہی کے حق میں معلوم ہوتی۔ انہی دنوں قادیان کے بتوں نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا، وہ بھی اپنے راستے کے پہاڑ سے ٹکرانے کو نکل پڑے۔

امیر شریعتؒ اپنے رفیقوں کی معیت میں بھیرہ (ضلع سرگودھا) سے اس مشن پر یوپی

تک دورہ کرنے کا ارادہ لے کر روانہ ہوئے کہ مسلمانوں کو سمجھائیں کہ مسجد شہید گنج گری نہیں گرائی گئی ہے۔ اس کے لیے کن کن ہاتھوں نے کیا کیا حرکتیں کیں ہیں۔ چنانچہ مجلس احرار کا یہ وفد امیر شریعتؒ، مولانا حبیب الرحمٰن، شیخ حسام الدین اور (جانباز مرزا) راقم الحروف پر مشتمل مسلسل سفر کے بعد پنجاب کی سرحدوں کو عبور کر کے یو۔پی میں داخل ہوا۔ یہاں سے مولانا حبیب الرحمٰن اور شیخ حسام الدین جماعتی ضرورت کے لیے واپس کر دیے گئے۔ اب امیر شریعت اور راقم اس سفر کے لیے ..... باقی رہ گئے۔ یہی وہ تاریخی سفر ہے جس کے دوران لکھنؤ میں امیر شریعت پر انکشاف ہوا کہ یہاں (لکھنؤ میں) مدح صحابہؓ قانوناً جرم ہے اور اسی سفر میں امیر شریعت کے دل میں اس قانون کو ختم کرنے کے ارادے نے جنم لیا۔

یہ سفر کانپور تک جاری رہا، جب واپس ہوئے تو امیر شریعتؒ کی صحت تھکن کی وجہ سے بہت کمزور ہو رہی تھی۔ تاہم کچھ دن ستانے کے بعد ارادے، آرزوئیں اور عزم اسی طرح جوان تھے۔

لاہور پہنچے کچھ دن گذرے تھے کہ پولیس کا ایک ذمہ دار افسر میرے پاس آیا، اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے مجھ سے سوال کیا "آپ راجندر سنگھ آتش کو جانتے ہیں؟"

"جی ہاں"

میرے جواب پر اس نے سنبھل کر کہا "کیسے اور کب سے؟"

"۱۹۳۰ء میں راجندر سنگھ آتش میرے ساتھ لاہور بورسٹل جیل میں بطور سیاسی قیدی کے رہے ہیں۔ اس کے بعد میری اُن کی ملاقات نہیں ہوئی"

میرے جواب پر پولیس افسر نے کہا "چلیے وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے"

"کہاں"؟ — "تھانے کے حوالات میں" — اب میری پریشانی قدرے بڑھی کیونکہ یہی نوجوان اخبار کی ایک خبر کے مطابق گذشتہ دنوں کلکتہ سے انقلابی پارٹی کا ممبر ہونے کے شبہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ پولیس افسر نے مجھے مجبور کیا کہ میں راجندر سنگھ آتش سے ملوں

ان کے ساتھ جب میں متعلقہ تھانے پہنچا تو حوالات میں میں نے ایک ایسے نوجوان کو دیکھا جو میرے تصور سے بالکل جدا تھا۔

۱۹۳۰ء میں جس راجندر سنگھ آتش کو میں نے دیکھا تھا، اس کے سر کے بال اور ڈاڑھی اس کی عمر سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن پانچ برس گزرنے پر راجندر سنگھ آتش یورپین لباس میں ایک ایسا فیشن ایبل نوجوان تھا، جس کا سر اور منہ سکھ مذہب کے اصولوں سے غداری کر چکا تھا۔

"آئیے جانباز صاحب! کیسے مزاج ہیں"؟ "ٹھیک ہیں"۔ لیکن آپ نے یہ کیا کیا؟ بس یہی کہانی سنانے کے لیے آپ کو بلایا ہے، یاد ہے گذشتہ دنوں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ آپ نے پنجاب اور یوپی کا دورہ کیا تھا"۔ "جی ہاں"۔ "میں اس پورے دورے میں آپ کے ساتھ ساتھ تھا"۔ اس کے بعد راجندر سنگھ آتش نے ہمارے سفر کے تمام واقعات من وعن سنائے جس کی تصدیق کرنا پڑی۔

"لیکن آپ نے ہمارے ساتھ یہ دورہ کیوں کیا"؟

میرے اس سوال پر اس نے پولیس افسر سے کہا کہ ہم کوئی بات کرنا چاہتے ہیں، آپ ذرا ہٹ جائیں۔ مگر پولیس افسر نے کہا "میں آپ دونوں کی گفتگو میں ڈیوٹی پر متعین کیا گیا ہوں"۔ اس پر راجندر سنگھ آتش نے اپنی گفتگو کا لہجہ آہستہ کر دیا۔ اس نے بتایا۔

"خلیفہ قادیان بشیر الدین محمود نے مجھے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے قتل پر مقرر کیا تھا، اور اس کے عوض دس ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا، جس کی ادائیگی پانچ ہزار روپیہ پیشگی اور پانچ ہزار واقعہ کے بعد طے پائی تھی، لیکن میں ارادتاً ایسا نہیں کر سکا۔ حالانکہ مجھے اکثر مواقع میسر آئے۔ لیکن میری ناکامی کی وجہ صرف یہ رہی کہ شاہ جی کے قتل کرنے کو میرا جی نہیں چاہا۔ ایک آدمی عوام کو اچھی باتیں سناتا ہے خواہ وہ کسی مذہب سے کیوں نہ ہو، میں

اپنی ذاتی غرض کے لیے اسے کیوں قتل کروں"۔

اس کے بعد جب میں واپس قادیاں پہنچا تو میری ناکامی پر بشیرالدین محمود نے کہا، تو پھر تم ڈاکٹر گوربخش سنگھ[۵] کو قتل کر دو۔ لیکن میں نے اس پر بھی انکار کیا۔ میرے اس انکار پر مرزائیوں نے مجھے ایک سازش کے تحت کلکتہ میں گرفتار کرا دیا ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ میں یہ تمام واقعہ عدالت میں بیان کر دوں گا۔۔۔۔۔۔ آپ کی جماعت (مجلس احرار) اس مقدمے میں میری امداد کرے گی"؟

یہ سارا کچھ سننے کے بعد میں نے کہا "پارٹی سے مشورے کے بعد ہی کوئی رائے دے سکتا ہوں"۔ اس پر راجندر سنگھ سے میری ملاقات دوسرے دن پر ملتوی ہو گئی۔

دوسرے دن چودھری افضل حق سے ابھی پہلے دن کی گفتگو کا ذکر چل ہی رہا تھا کہ اخبارات آ گئے۔ چودھری صاحب نے پہلی سُرخی دیکھتے ہی کہا، "لو! اس کو تو پولیس نے رہا کر دیا"۔ معلوم ہوا کہ پولیس افسر نے ہم دونوں کی گفتگو اپنے حکام کو پہنچائی، تو پنجاب کی حکومت نے بہتری اسی میں سمجھی کہ راجندر سنگھ کو رہا کر دیا جائے۔

قضا و قدر کی تحریریں نہ مٹائی جا سکتی ہیں، اور نہ ہی ان کا کوئی نوشتہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ لیکن انسان ہے کہ اپنے قلم کے فیصلے کی طرح ان میں بھی ترمیم چاہتا ہے۔ آگرہ، بمبئی اور شجاع آباد کے بعد امیر شریعت کے قتل کی یہ چوتھی کوشش تھی جو بہرحال ناکام رہی۔

قاتل سے ملاقات

حالات کی پیشانی شکن آلود تھی فضاؤں میں انتقامی ارادوں کے تیور ہنوز سُرخ تھے کہ امرتسر میں راجندر سنگھ آتش سے پھر ملاقات ہو گئی۔ اس نے امیر شریعت سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن میں اسے طرح دے گیا۔ آخر جب اس کا اصرار بڑھا تو میں اسے امیر شریعت کے مکان پر لے گیا۔ قاتل اور مقتول کا آمنا سامنا

---

[۵] ڈاکٹر گوربخش سنگھ قادیاں میں مرزائیوں کا سخت مخالف تھا۔

ہونے سے پیشتر میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، اور اپنی تسلّی کے لیے راجندر سنگھ کے جسم کو ہاتھ اور نگاہوں سے کھنگال ڈالا، جس پر وہ مسکرایا۔ اس کی یہ مسکراہٹ میرے شبہ پر طنز تھی۔

"لباس اور جسم کی تلاش میں اب کیا رکھا ہے جانباز! دل اور آنکھوں میں دیکھو، جن میں ندامت کے کس قدر آنسو ہیں، جو شاہ جی کی بھینٹ کرنے آیا ہوں۔ میں اپنے پرماتما کی سوگند کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میرے پاپ مجھے پچھتاپ کے لیے اس عظیم انسان کے چرنوں میں سیس جھکا دینے کے لیے مجبور کر رہے ہیں کہ جس کی زبان نے میری چھری کو کُند کر دیا اور میرے ارادوں کو موت آگئی، ورنہ آج قاتل اور مقتول کا رشتہ ٹوٹ چکا ہوتا۔"

یہ کہتے ہوئے راجندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور میں نے امیر شریعت کے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے بھائی! اندر آجاؤ۔" یہ امیر شریعتؒ کی آواز تھی، ہم بیٹھک میں چلے گئے۔ امیر شریعتؒ پان بنانے میں مصروف تھے۔

"یہ آپ کا قاتل ہے شاہ جی!" میں نے عرض کیا۔ امیر شریعتؒ نے ایک نظر راجندر سنگھ کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ "ہاں بھائی! ایسے ہی لوگ میرے قاتل ہوتے ہیں۔" میں نے اپنے فقرے کو دوبارہ ذرا وضاحت سے دہرایا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور متعجب ہو کر سوال کیا۔ "کیا مطلب"؟

"یہ راجندر سنگھ آتش ہے، یہ آپ کے حالیہ طویل سفر میں مرزائیوں کی طرف سے آپ کے قتل پر مامور کیا گیا تھا۔"

"اچھا — کیوں بابو! یہ درست ہے؟" "ہاں شاہ صاحب!"۔

"تو پھر کون سی چیز مانع رہی؟" "یہ میں نہیں جانتا شاہ صاحب! مگر آپ کے طرزِ تکلّم

نے مجھے اس گناہ سے بچائے رکھا؟" اس پر امیر شریعتؒ نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اور راجندر سنگھ کو مخاطب کر کے کہا:۔

"میرا طرز تکلّم مجھے کیا بچا سکتا ہے بابو! موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یاد رکھو، جو رات قبر کی ہے وہ باہر نہیں آسکتی، اور جس رات کو باہر آنا ہے، اسے دنیا کی کوئی طاقت قبر کے سپرد نہیں کر سکتی۔ البتہ تمہیں میری نصیحت ہے کہ بحیثیت انسان ہمیشہ انسان کی بھلائی کے لیے سوچا کرو۔ دولت ہاتھ کی میل ہے بابو! اس کے لالچ میں اگر تم مجھے قتل بھی کر دیتے اور میرے قتل کے الزام سے تمہارا دامن محفوظ بھی رہتا تو کسی دوسرے موقعہ پر بغیر جرم کے مارے جاتے ——— خیر!"

امیر شریعت پھر مسکرائے اور قرآن کریم کی چند آیات کا ترجمہ سناتے رہے کہ اتنے میں چائے آگئی۔ راجندر سنگھ امیر شریعت کی گفتگو اور قرآن عزیز کے لفظوں میں اپنے ماضی پر غور کرتا ہوا بے اختیار رونے لگ پڑا اور روتا ہوا امیر شریعتؒ کے قدموں پر گر پڑا۔

"اپنے رب کے سامنے گرو جو تمہیں معاف کرے۔ میں تو تمہارا چاکر ہوں بابو! لو چائے پیو!"

امیر شریعتؒ اور راجندر سنگھ آتش کے درمیان یہ ملاقات مغرب کی نماز تک رہی۔

تحریک مدح صحابہؓ

پنجاب اور یوپی کا دورہ کرتے ہوئے لکھنؤ (احاطہ شوکت علی) میں تقریر کے دوران کسی نے امیر شریعتؒ سے صحابہ کرامؓ کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے پر بلند آواز سے پکارا۔

"شاہ صاحب! یہاں صحابہ کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنا جرم ہے"

یہ فقرہ سنتے ہی امیر شریعتؒ نے مجمع سے دوبارہ تصدیق کی ——— اور معاً بعد طبیعت میں یکایک تیزی آگئی، اور صحابہ کرامؓ کا بار بار نام لیا، اور ہر نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہا۔

حالانکہ امیر شریعتؒ چار روز لکھنو ٹھہرے، لیکن قانون اور حکومت دونوں خاموش رہے۔

امرتسر واپس پہنچ کر جماعت سے صلاح و مشورے کے بعد ۲۶۔ اگست ۱۹۳۵ء کو دوبارہ لکھنو گئے اور چوک فرنگی محل میں تقریر کے دوران کہا:۔

"مجھے افسوس ہے کہ انگریز نے لکھنؤ میں ایک ایسا قانون جاری کر رکھا ہے، جس کی رو سے منقبتِ صحابہ کرنا اور کرانا جرم ہے۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمان غنیؓ و علیؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف کرنا قابلِ سزا جرم ہے، اور یہ سزا دو سال قید تک ہے۔

غضب خدا کا اسّی ہزار اہلِ سنت والجماعت کی آبادی اور وہ اس قانون کو حکومت سے نہیں بدلواتی۔ چند ماہ ہوئے ہمارے بھائی غازی منے خاںؒ نے یہاں مدحِ صحابہ پڑھی تھی جس کی پاداش میں ان پر مقدمہ چل رہا ہے۔ میں حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اس قانون کو فوراً منسوخ کر دے۔ یہ مداخلت فی الدّین ہے۔ حکومت نے خود مذہب کی آزادی کا اعلان کر رکھا ہے۔

گالیاں بکنا تو جرم ہو سکتا ہے، مگر کسی کی تعریف کرنا کیونکر جرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج حکومت نے قمار بازی، شراب نوشی اور عصمت فروشی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ لیکن خلفائے راشدینؓ کی تعریف پر پابندی عائد ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنی پوزیشن پر غور کرے۔

میں شیعہ حضرات سے خطاب نہیں کر رہا، بلکہ میرا روئے سخن حکومت کی طرف ہے، شاید کل کو کچھ اور سمجھ لیا جائے۔ اس لیے کان کھول کر سن لو، میں تمام یوپی کو ایک مرکز پر جمع کر دوں گا، اور اس قانون کو آئینی جدوجہد سے

ؒ لکھنؤ مجلس احرار کے ناظم اعلیٰ تھے۔

ختم کرا کر دم لوں گا۔ اور اگر اس طرح بھی اس قانون کو ختم نہ کیا گیا تو پھر میں بے آئینی بھی کر سکتا ہوں"

ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات میں حکومت ان دنوں کسی طرح بھی دوسرے رنگ میں سوچنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ کیونکہ ۱۹۳۵ء کے آئین کے نتیجہ میں جو واقعات سامنے آنے والے تھے، ان کے پیشِ نظر صوبائی جھگڑوں کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ لہٰذا امیر شریعتؒ کی مندرجہ بالا تقریر کو حکومت نے ہوا کے دوش پر لٹکا دیا۔ اس کے بعد مجلسِ احرار نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور یہاں سے تحریک مدحِ صحابہؓ کی ابتداء ہوئی۔

قادیان میں نمازِ جمعہ

احرار ہمیشہ خیالات اور جذبات کے دو مختلف محاذوں پر برسرِ پیکار رہے ہیں، اوّل ہندوستان میں اسلام کا غلبہ اور دوسرے درجہ پر وطن کی آزادی۔

ان آمنے سامنے کے دو مختلف مورچوں پر احرار کبھی انگریز سے اور کبھی ہندو سے برسرِ آزمار رہے۔

۱۹۳۵ء میں انگریز نے جو آئین ہندوستان کو دیا۔ احرار اپنے دونوں مقاصد کے لیے اس آئین کے تحت الیکشن میں اترنے کی تیاری کر رہے تھے کہ پنجاب میں مسجد شہید گنج اور یو۔ پی میں مدحِ صحابہؓ کے ڈوا لیسے جال پھیلائے جن کا تعلق احرار کے جذبۂ ایمان سے تھا۔ اسی سنہ میں امیر شریعتؒ کے مقدمے کا فیصلہ لکھتے وقت گورداسپور کے سیشن جج مسٹر جی۔ ڈی کھوسلہ نے مرزائیت کے تابوت میں جو میخ ٹھونکی، اس نے قادیانی مذہب کی بنیادوں میں دراڑ ڈال دی، چنانچہ اس خفّت کو مٹانے کے لیے خلیفہ قادیان بشیر الدین محمود نے احرار کو مباہلہ کے لیے قادیان آنے کی دعوت دی۔ جسے احرار نے فوراً قبول کر لیا۔ جب وہ تیار ہو کر قادیان جانے لگے، تو قادیانیوں نے اپنی سرکار

سے واویلا کرنا شروع کیا کہ دیکھو احرار پھر قادیان آ رہے ہیں۔ چنانچہ حکومت نے قادیان میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا۔ چونکہ احرار اس سفر کا عزم کر چکے تھے، لہٰذا جماعت نے قادیان میں نماز جمعہ پڑھنے کا اعلان کر دیا اور امامت کے لیے امیر شریعتؒ کا نام تجویز کیا گیا۔

سال بھر کی دوڑ دھوپ اور مقدمہ سے رہائی کے بعد امیر شریعتؒ کچھ دنوں گھر میں سستانے کا ارادہ رکھتے تھے کہ جماعتی فیصلے کے تحت مولانا مظہر علی اظہر امرتسر پہنچے اور امیر شریعتؒ کو جماعتی فیصلے سے آگاہ کیا۔ امیر شریعتؒ نے مجلس احرار اسلام ہند کے ناظم اعلیٰ کا حکم سن کر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا ــــ "بہت اچھا، جو مزاج یار میں آئے"

۶ دسمبر ۱۹۳۵ء کو امیر شریعتؒ بذریعہ گاڑی امرتسر سے قادیان روانہ ہوئے۔ اس وقت احرار دوستوں کا جم غفیر بھی ان کی معیت میں اسی گاڑی پر سوار ہوا۔ بٹالہ ریلوے اسٹیشن پر پولیس افسروں نے امیر شریعتؒ سے دفعہ ۱۴۴ کے نوٹس پر تعمیل کرانی چاہی، جس کی رو سے امیر شریعتؒ قادیان کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتے تھے، لیکن امیر شریعتؒ نے تعمیل نوٹس سے انکار کر دیا، اور اپنا سفر جاری رکھا۔ جینتی پور کے ریلوے اسٹیشن پر سب انسپکٹر پولیس خاں چراغ الدین نے امیر شریعتؒ کو دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی پر گرفتار کر لیا، اور اسی وقت سفری مجسٹریٹ مسٹر ڈرّانی نے آپ کو تین ماہ قید اور ایک سو روپیہ جرمانہ اور عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید ایک ماہ قید بامشقت کی سزا کا حکم سنا کر گورداسپور ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا، جہاں سے ایک ہفتہ بعد آپ کو لاہور سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ قادیان میں نماز جمعہ کی تحریک نے مستقل شکل اختیار کر لی، اور ہر جمعہ کوئی نہ کوئی گرفتاری ہوتی آخر ایک ماہ بعد حکومت نے دفعہ ۱۴۴ واپس لے لی، مگر لیڈروں کو اپنی میعادِ اسیری گزارنے کے بعد رہا کیا گیا۔ چنانچہ امیر شریعت ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور سنٹرل جیل سے رہا ہو کر آئے۔

سینما کی تعمیر

امیر شریعت رہا ہو کر آئے تو ملک کی سیاسی فضا یکسر بدلی ہوئی پائی۔ مجلس احرار سمیت تمام سیاسی جماعتیں اپنے اپنے مینی فسٹو کے تحت

انتخابی ہنگاموں میں مصروف تھیں۔ امیرِ شریعتؒ کا مزاج ان ہنگاموں سے متفق نہ تھا۔ آپ فرمایا کرتے کہ:-

"برطانیہ نے ہندوستان کو ایسا آئین بنانے کی اجازت کیونکر دے دی، جس کے تحت صوبے خود مختار ہوں گے"!

اور ساتھ ہی غالبؔ کا یہ شعر پڑھتے ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لیکن جماعت (مجلسِ احرار) الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ لہٰذا امیرِ شریعتؒ نے بادلِ نخواستہ اپنی طبیعت کا رخ بھی اسی طرف موڑ لیا۔

مجلسِ احرار کی پوزیشن انہدامِ شہید گنج کے بعد عوام میں مخدوش ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود پنجاب کی سیاسی زندگی احرار سے عبارت تھی اور دوسری کسی جماعت یا افراد کے لیے مشکل تھا کہ وہ احرار کے بغیر آگے بڑھ سکے۔ چنانچہ سر فضل حسین ایک طرف سر سکندر حیات سے تو دوسری طرف قائداعظم محمد علی جناح سے پنجاب کے آئندہ انتخابات کے سلسلہ میں مصروفِ گفتگو تھے۔ اسی طرح سر سکندر حیات کے ایما پر نواب مظفر علی جو ان دنوں گورنر کی انتظامیہ کے ممبر تھے، مجلسِ احرار سے ناطہ جوڑ رہے تھے۔

اس موقعہ پر صدر گوردوارہ پر بندھک کمیٹی راولپنڈی نے جامعہ مسجد راولپنڈی کے عقب میں سینما تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ شہر کے مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود سینما مکمل ہو رہا تھا کہ مسلمانانِ راولپنڈی نے امیرِ شریعت کو اپنی مشکلات سے آگاہ کیا اور انہیں راولپنڈی آنے کی دعوت دی۔

انتخابات کا زمانہ اپنے جلو میں جن واقعات کو جنم دیتا ہے، ان کے شب و روز میں ہزاروں بے بنیاد کہانیاں اپنے نقش و نگار تراشتی ہیں، اور مٹ جاتی ہیں۔ لیکن

ان کے معمار اپنے ذہن کی قدوکاوش میں فارغ نہیں بیٹھتے ۔ امیر شریعت کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ جماعت کے انتخابی پروگرام کے درمیان کوئی دوسری مصروفیت اختیار کرتے ، تاہم اس دینی کام کیلئے انہوں نے راولپنڈی کیلئے وقت نکال لیا۔

راولپنڈی میں سکھ ، مسلمان کشیدگی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ دونوں طرف آگ برابر سلگ رہی تھی ۔ ہندو اپنی دولت کے سہارے سکھوں کی پشت پناہی کر رہے تھے ۔ امیر شریعت نے دو ، ایک دن میں شہر کے حالات دیکھے اور سنے ۔ آخر معززین شہر کو جن میں سکھ ، ہندو اور مقامی حکام بھی شامل تھے ، باہم مل بیٹھنے کی دعوت دی ۔ یہ اجتماع شہر کی جامع مسجد میں ہوا ۔ اس اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے امیر شریعت نے کہا :۔

" سکھ صاحبان اور دوسرے معزز دوستو ! میں ایک مسافر ہوں ۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ کے شہری معاملات میں مداخلت کروں ۔ گذشتہ برسوں سے میری زندگی کا ایک مشن رہا ہے کہ میں انسانوں کو لڑتا دیکھنا پسند نہیں کرتا ، پھر جبکہ ایک تیسری حکومت ہم کو لڑتا دیکھ کر خوش ہوتی ہے ، ہمارے لیے آپس کی صلح اور بھی زیادہ مفید اور کارآمد ہے ۔ جو عرصے سے جو قضیہ آپ کے شہر میں چل رہا ہے ، جس نے آپ کی شہری زندگی میں ایسا زہر گھول دیا ہے کہ آپ ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے ہیں ۔

یہ مسجد ہے ، اور ایک مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت سے اس کا احترام میرے لیے لازمی ہے ۔ اسی قدر آپ کو بھی اس کا احترام کرنا چاہیے ۔ اسی طرح میں گوردوارہ کی بھی عزت کرتا ہوں ۔ کیونکہ وہ بھی رب کی عبادت گاہ ہے ۔ گو میرا ، آپ کا عقیدہ عبادت جدا جدا ہے ۔

اگر گوردوارہ کے سامنے یا برابر میں کوئی ہنگامہ ہو، تو آپ برداشت کریں گے؟ یقیناً نہیں۔ اسی طرح یہ حق مجھے بھی دو کہ میں مسجد کے احترام میں آپ سے گذارش کروں، کہ آپ یہاں سینما کی تعمیر بند کردیں یہ میری درخواست ہے۔

میں یہ درخواست آپ سے ایسے وقت کر رہا ہوں، جب کہ سارا ہندوستان انگریز سے آئینی لڑائی میں مصروف ہے۔ اس میں آپ کا فائدہ ہے کہ شہر میں امن ہو جائے گا۔ بہو بیٹی کی عزت محفوظ رہے گی شہری زندگی کسی دوسری طرف دھیان کر سکے گی۔

مجھے آپ جانتے ہیں، میں ان دھندوں کا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن آپ کی پریشان زندگی اور اللہ کے گھر کی بے حرمتی نے مجھے مجبور کیا کہ میں پارٹی کا کام چھوڑ کر یہاں حاضر ہوا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ سکھ صاحبان میری گذارش کو قبول کریں گے؟

امیر شریعت کی اس تقریر نے اجتماع کو متاثر کیا۔ مقامی حکام کی موجودگی میں گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے عہدیداران نے وعدہ کیا کہ آئندہ سے سینما کی تعمیر روک دی جائے گی۔ صبح ہوتے ہی سکھ عوام کو اس فیصلے کی اطلاع ملی، تو انہوں نے مذہبی ضد کی بناء پر رات کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا، اور شہر کے حالات زیادہ خطرناک ہو گئے۔ دوسرے دن امیر شریعت نے جامعہ مسجد میں تقریر کرتے ہوئے سرکاری حکام اور شہری عوام کو مخاطب کرتے ہوئے خطبہ مسنونہ کے بعد کہا:۔

"کل رات معزز افسران اور فوڈ ڈپٹی کمشنر کی موجودگی میں سکھ صاحبان سے جو فیصلہ ہوا تھا۔ مجھے افسوس ہے، کہ سکھ رہنما اپنی قوم سے وہ فیصلہ منوا نہ سکے۔ اب میں اپنا فیصلہ اپنی قوم سے منوا کر دکھاؤں گا۔ بشرطیکہ

مقامی حکام درمیان میں حائل نہ ہوں۔ ہاں اگر وہ انتظامی معاملات
میں کوئی چارہ کریں، تو اس سے میں منع نہیں کروں گا۔
میری اس گفتگو سے یہ مراد نہ لی جائے کہ مسلمان سکھ بھائیوں سے
دست وگریباں ہوں گے۔ نہیں، بلکہ میں عدم تشدد کا حامی ہوں اور
اسی پرکاربند رہ کر اپنی بات اپنی قوم سے منواؤں گا۔ فیصلہ کل رات
کو ہوگا۔
۲۴ گھنٹے باقی ہیں، سکھ صاحبان کو اپنے رویے پر غور کرنا چاہیے۔"
دوسرے دن شہر میں حالات اور بھی کشیدہ ہوگئے۔ دن بھر سکھ پریشان رہے
نہ جانے شاہ جی رات کو کیا حکم دیں۔ حکومت اپنی جگہ سوچ میں رہی، شہر میں پولیس
اور فوج کی تقرری میں اضافہ کردیا گیا۔ رات پھر جلسے کا اعلان تھا۔ جامع مسجد میں
انسانوں کا اس قدر ہجوم اس مسجد کی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ امیر شریعتؒ اس روز
خلاف معمول نماز عشاء کے ساتھ ہی تقریر کے لیے کھڑے ہوگئے، اور آپ نے صرف
مسلمان نوجوانوں سے چند منٹ خطاب کیا۔ زندگی میں اتنی مختصر تقریر امیر شریعتؒ
نے کبھی نہیں کی تھی:۔

"عزیزو! ہماری لڑائی کسی سے نہیں، اگر کوئی قوم اپنی ضد پر اتر آئے
تو ہمیں خوف نہیں کھانا چاہیے، لہٰذا ایسا کام کرو کہ سانپ بھی مرجائے
اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، میرے ساتھ وعدہ کرو کہ جو میں کہوں گا وہی کروگے۔۔۔"
اس موقعہ پر تمام مجمع نے ہاتھ اٹھا کر وعدہ کیا، امیر شریعتؒ نے کہا:۔
"دیکھو! جو میں کہوں گا وہی کرنا ہوگا، اگر کسی دوسری حرکت کی شکایت
آئی تو میں ناراض ہوکر چلا جاؤں گا۔"
اس پر مجمع نے پھر وعدہ کیا۔

"عزیزانِ من! یا تو مسجد نہ رہے اور یا سینما نہ بنے۔ میں نے مقدور بھر کوشش کی، شہر کے ذمہ دار حکام گواہ ہیں، کہ سکھ رہنماؤں نے وعدہ کے باوجود بات نہیں مانی۔ خیر! اب تم اپنا کام کرو، یا تو مسجد کے قریب سینما نہ ہو اور یا سینما کے قریب مسجد نہ ہو، بس! لیکن میری یہ درخواست یاد رہے کہ اینٹوں کے سوا انسانوں پر ہاتھ نہ اٹھیں۔"

امیر شریعتؒ کی تقریر سنتے ہی تمام مجمع سینما کی طرف دوڑا، اور صبح اٹھے تو ایک اینٹ وہاں باقی نہیں تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جنوں کی فوج نے راتوں رات سینما کا تمام ملبہ اٹھا کر نہ جانے کہاں پھینک دیا کہ اب اس کا نشان تک نہیں ملتا۔

حالانکہ پولیس کا انتظام تھا، سکھ نوجوان بپھرے کھڑے تھے لیکن امیر شریعتؒ نے پہلے روز جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا، سرکاری حکام اس سے مطمئن تھے، سکھ رہنماؤں نے مسجد میں جو وعدے کیے تھے، وہ ان سے منحرف ہو چکے تھے، لہٰذا مسلمان نوجوانوں کے ہاتھ جب رات کے اندھیرے میں زیرِ تعمیر سینما کی طرف بڑھے، تو سکھ قوم کے وقتی جذبات پولیس کی حفاظتی دیوار توڑنے کی جرأت نہ کر سکے۔

راولپنڈی کا یہ تاریخی میدان آج مجاہد پارک کے نام سے مشہور ہے۔

تبلیغِ اسلام

۱۹۳۵ء کے برطانوی آئین نے جہاں حالات میں مزید ردوبدل کیا، وہاں اچھوتوں کو ہندوستان کی ایک الگ قوم قرار دیتے ہوئے یہ حق بھی دیا کہ وہ بحیثیت ایک ہندوستانی قوم اپنی قومیت برقرار رکھتے ہوئے نئے قانون کے مطابق الگ انتخاب لڑ سکتے ہیں، جبکہ اس سے پیشتر کے آئین میں اچھوتوں کا ووٹ ہندو قوم کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔

اس اعلان نے ہندوؤں میں ایک خاص قسم کا سیاسی ہیجان پیدا کر دیا۔ مہاتما گاندھی نے انہی دنوں برطانیہ کے اس قانون کو تبدیل کرانے کے لیے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو مرن برت

رکھنے کا فیصلہ کیا۔ نیز ہندو قوم کو اچھوتوں پر اپنے مندروں کے دروازے کھول دینے کا مشورہ بھی دیا۔

سیاسیات کی دوڑ میں قدم نہیں ناپے جاتے، ووٹ گنے جاتے ہیں، جو قوم صدیوں سے اچھوتوں کے سائے سے دامن بچاتی رہی، اپنی سیاسی ضرورت کیلئے اس نے نہ صرف اچھوتوں کو انسان تسلیم کیا بلکہ انہیں اپنی برادری کا جزو سمجھنے پر مجبور ہوگئی۔ انہی دنوں ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو لاہور میں اچھوت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے امیر شریعتؒ نے مسلمان قوم کو پیغام دیا:۔

"اس وقت ہمارے سامنے تین مسئلے سب سے زیادہ اہم اور غور طلب ہیں۔ پہلا مسئلہ انتخاب کا ہے، جس کا ظاہر اتنا دلفریب ہے کہ بڑے سے بڑا تارک الدنیا گوشہ نشین بھی اس کے حُسن دلفریب کی تاب نہ لاسکا، اور بے چین ہوکر میدانِ انتخاب میں نکل آیا، نہ کوئی ہندو بچا نہ سکھ اور نہ عیسائی۔ مسلمان بھی اس سے بے نیاز نہیں۔ کوئی جماعت بھی ایسی نہیں جو مسئلہ انتخاب میں دلچسپی نہ رکھتی ہو۔

دوسرا مسئلہ ختم نبوّت کا ہے۔ چونکہ مسلمان سیاسی اُلجھنوں میں مصروف ہو گئے ہیں، اس لیے انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ ہندوستان کو ابدی غلامی میں جکڑے رکھنے کے لیے قادیانی نبوّت اپنا جال پھیلا رہی ہے۔ مسلمانوں کو اس دائمی لعنت سے بچنے کے لیے کوئی راہ سوچنا بڑا ضروری ہے۔

تیسرا اہم مسئلہ اچھوتوں کا ہے۔ اس وقت تمام ہندوستان کی توجہ ڈاکٹر امبیدکار[1] کے اعلانات کی طرف ہے، وہ پولیٹیکل اچھوت ہے

---

[1] اچھوتوں کا لیڈر

اور ہندوؤں سے بخوبی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس وقت ہندوؤں کو دبانے سے کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ اب وہ ٹاٹ پر بیٹھنا نہیں چاہتا لیکن ہندوستان کے آٹھ کروڑ اچھوت جو ہزاروں سال سے حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہے، اگر ان کو مساوات اور انسانیت کا درجہ کسی مذہب میں حاصل ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے، اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب اچھوتوں کو اپنے میں حقیقی طور پر جذب نہیں کر سکتا۔

کائنات میں سب سے بڑا اچھوت غلامی ہے۔ غلام کا جسم اور اس کی کمائی اپنی نہیں ہوتی، بلکہ مالک کی ہوتی ہے۔ لیکن اسلام نے دنیا میں غلام کا درجہ بلند کر دیا ہے، اور اچھوت پر سب سے بڑا احسان کرنے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جنہوں نے اپنی پھوپھی زاد ہمشیرہ زینبؓ سے منسوب کر دی، جو غلام تھا۔ اسلام نے مذہب کے معاملہ میں جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنے عمل سے اسلام کی تلقین کی، کہ ایسے لوگوں سے کیا سلوک کیا جاتے جو مسلمان نہیں ہے

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی!

لیکن بغیر نشے کے کسی کو پچھاڑنا کام رکھتا ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے عمل سے اور اپنے مذہب کی خوبیوں کے ذریعے اچھوتوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ وہ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں اور سوائے مذہب اسلام قبول کرنے کے ان کے لیے کوئی چارہ نہ رہے۔

اس ضمن میں امیر شریعتؒ نے اپنے چشم دید واقعات بیان کیے، جن کی رو سے اچھوت ہمیشہ اپنے کو انسانی دائرے سے بھی خارج سمجھتے ہیں۔

مسلمانو! کروٹ لو اور اٹھا لو ان گرے ہوئے اچھوتوں کو اور اپنے سینے سے لگاؤ۔ ہم روپیہ دے کر کبھی بھی ان کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ نہ ہندو قوم کی طرح ہم انہیں سیاسی لالچ دے کر ان کے ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام! اسلام ہے تشنگی بجھانے کیلئے دریا کسی کے گھر نہیں جاتا، ہمیشہ پیاسے ہی دریاؤں پر جاتے ہیں۔ کوئی تلوار کارگر نہیں ہوتی۔ لیکن اخلاق کی تلوار انسان کو ہمیشہ کے لیے رام کر لیتی ہے۔ اس لیے اچھوتوں کو ساتھ ملانے اور دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اس خلقِ عظیم کو اختیار کرو جو اسلام نے تم کو بخشا ہے۔"

ڈسکہ میں انتخابی معرکہ

متحدہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ۱۹۳۶ء کا سال آئینی جدوجہد کا اہم سال قرار دیا جا سکتا ہے، اس سال کسی بھی سیاسی جماعت نے غیر آئینی حرکت نہیں کی، بلکہ ہر پارٹی انتخاب کے ذریعے اقتدار کی کشمکش میں مصروف رہی۔

مجلس احرار، مسجد شہید گنج کے ملبے کے ڈھیر سے نکل کر ہنوز اپنے کپڑے جھاڑ رہی تھی کہ انتخاب کا ہنگامہ سر پر آن پہنچا۔ چنانچہ اس کی نگاہِ انتخاب نے پنجاب میں جن شہروں اور قصبات کو دین، وطن، اور جماعتی ضرورت کے لیے منتخب کیا ان میں ڈسکہ (ضلع سیالکوٹ) کی سیٹ پر اس کی خاص نظر رہی۔ گذشتہ سال مجلسِ احرار کا وفد جب دہلی میں وائسرائے ہند سے ملا کر وہ چودھری سر ظفراللہ خاں کو اپنی

انتظامیہ میں شامل نہ کریں تو وائسرائے نے جواب میں کہا کہ سرظفر اللہ خاں مسلمانوں کے ووٹ سے منتخب ہوکر آتا ہے۔ مجلسِ احرار اس وقت تو لاجواب رہی۔ مگر اب وقت آگیا تھا کہ وائسرائے کے سوال کا جواب دیا جائے۔

اگرچہ امیرِ شریعت انتخابات کے دنوں پنجاب کے علاوہ صوبہ یو۔پی میں بھی مصروف تھے تاہم ان کی زیادہ تر توجہ کا مرکز ڈسکہ کی سیٹ تھی۔ چودھری سرظفر اللہ خاں ہمیشہ اسی سیٹ سے مسلمانوں کے ووٹوں سے کامیاب چلا آرہا تھا اور آج اس کا بھائی چودھری اسد اللہ خاں ایڈووکیٹ اسی سیٹ پر الیکشن کے میدان میں سامنے آیا تھا، سرظفر اللہ خاں اپنی جاٹ برادری اور ضلع میں مقبولِ عام تھا۔ سرکاری اثر و رسوخ بھی اسے پناہ دیئے ہوئے تھا۔ اس تحصیل کے مسلمانوں پر چودھری ظفر اللہ خاں کا اثر ریاستی نواب کی طرح تھا، ایسے حالات میں یہ ٹکراؤ بڑی جان جوکھوں کا کام تھا، خصوصاً جبکہ الیکشن بھائی چارے اور برادریوں کے نام پر لڑے جا رہے ہوں۔

بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسی برادری کے ایک معزز جاٹ چودھری غلام رسول ستراہ جو اپنے حلقہ میں خاصے رسوخ کے مالک تھے، مجلسِ احرار کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے لیے آمادہ ہوئے۔

چودھری غلام رسول کے پاس روپیہ، برادری کا اثر و رسوخ سب کچھ تھا۔ لیکن سرکاری دباؤ کا خوف سدِّ راہ تھا، دوسری جانب مجلس احرار سمجھتی تھی کہ یہی شخصیت سرظفر اللہ کے کفر کو توڑ سکے گی۔ چنانچہ ایک رات امیرِ شریعت نے چودھری غلام رسول سے کہا:۔

"دیکھو غلام رسول! اس وقت پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت کا سوال ہے، غیر ملکی حکومت کا نمائندہ (وائسرائے) کہتا ہے کہ تم ظفر اللہ کو مسلمان نہیں کہتے، لیکن اس حلقہ کا مسلمان تو اس کو ووٹ

دے کر منتخب کرتا ہے۔

چودھری صاحب! اگر آج اس سیٹ سے اس خاندان کا کوئی فرد جو حضور سرورِ کائنات کو آخری نبی نہیں مانتا، مسلمانوں کے ووٹ سے اسمبلی میں چلا گیا تو قیامت کے دن تم مجرم قرار پاؤ گے، کیونکہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے دنیوی خوبیوں سے نوازا ہے۔ برادری میں تمہارا اثر اس سے کم نہیں دولت اور عزّت تمہیں بھی خدا نے دی ہے۔ حکومت میں تمہارا بھی وقار ہے۔"

امیر شریعتؒ کی یہ باتیں سن کر چودھری غلام رسول نے کہا:۔

"شاہ جی! میں بہت ہی سیاہ کار ہوں، اس کے باوجود آپ حکم دیتے ہیں، تو حاضر ہوں لیکن میرے پاس برادری کی وہ قوت نہیں جو چودھری سر ظفر اللہ کے پاس ہے۔ روپیہ تو میں خرچ کر سکتا ہوں، لیکن حلقہ اور برادری کے ذمّہ دار لوگ شاید میرا ساتھ نہ دیں۔"

امیر شریعتؒ نے چودھری غلام رسول کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا:۔

"تم اللہ کے رسولؐ کی عزت رکھو، اللہ تمہاری عزت کا وارث ہوگا۔ مجلسِ احرار کی سرخ فوج آج سے تمہارے حلقہ میں متعین کر دی گئی ہے، بے فکر رہو۔"

پولنگ شروع ہونے میں قریباً ایک ماہ باقی تھا کہ ڈسکہ سیٹ کی مہم شروع کی گئی۔ امیر شریعتؒ دوسرے حلقوں کے علاوہ اس حلقہ میں زیادہ وقت اور توجہ صرف کرتے، مرکزی حکومت کے اشارے پر حکومتِ پنجاب نے بھی اس سیٹ پر خاصی توجہ دی۔ امیر شریعتؒ نے گاؤں گاؤں پھر کر جاٹ برادری کو خصوصیّت کے ساتھ حضور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ناموس پر اپیل کی، کہ وہ اپنا ووٹ برادری کے نام پر نہیں بلکہ حضورؐ کے نام پر دیں، تاکہ دشمنانِ دین کے تمام منصوبے خاک میں مِل جائیں۔ اس سلسلے میں امیر شریعتؒ جب

گھوئینکے (ضلع سیالکوٹ) پہنچے تو وہاں نماز جمعہ پڑھانے کا پروگرام تھا۔ چودھری عبدالغنی گھمن مع اپنی جاٹ برادری کے بندوقوں، پستولوں اور دوسرے اسلحہ سے مسلح ہو کر آن پہنچے کہ ہم عطاء اللہ شاہ بخاری کو تقریر نہیں کرنے دیں گے (یہ لوگ چودھری اسداللہ کے حامی تھے) امیر شریعتؒ نے کہا۔ اگر آپ اجازت دیں، تو میں صرف جمعہ کی نماز پڑھا لوں؟ اس پر انہوں نے ہاں کہہ دی۔ چنانچہ نماز سے پہلے امیر شریعتؒ نے قرآن کریم کا ایک رکوع پڑھا اور مخالفین سے پوچھا، اگر آپ حکم دیں تو اس آیت کی تشریح کر دوں۔ اس پر مخالفین کے دو حصے ہو گئے۔ ایک گروہ تشریح کے حق میں تھا اور دوسرا مخالف۔ آخر شاہ جی نے قرآن کریم کی تفسیر شروع کی، بس پھر کیا تھا کہ جمعہ کی نماز بھی مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ بعد پڑھی گئی۔ آخر میں مخالفین امیر شریعتؒ کے ہمنوا ہو گئے اور چودھری عبدالغنی گھمن کو اپنے ارادے میں بری طرح شکست ہو گئی۔

کیونکہ امیر شریعتؒ جاٹ برادری کے دل اپنے قبضے میں کر چکے تھے، ہزار جدوجہد کے باوجود سرکاری اثر و رسوخ بھی کوئی کام نہ دے سکا۔ یہ لڑائی امسلمان اور مرزائی کے عنوان پر لڑی گئی۔ امیر شریعتؒ کی مسلسل اور پیہم تقریروں سے ڈسکہ تحصیل کا مسلمان، مرزائی اور مسلمان کے درمیان حدِ فاصل کو سمجھ گیا، اور جب اس الیکشن کا نتیجہ سامنے آیا تو چودھری غلام رسول ستراہ نے چودھری اسداللہ خاں ایڈووکیٹ کو ہزاروں ووٹوں سے شکست دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ سیاسی طور پر اس گھرانے کا وقار ڈسکہ تحصیل سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اور تحریک مرزائیت کو خاصہ نقصان پہنچا۔

حضرت مدنیؒ سے اختلاف

انتخابی موسم بھی عجیب موسم ہوتا ہے، ہر پارٹی سیاسی اکھاڑوں میں ایسے ایسے داؤ پیچ کھیلتی ہے کہ آدمی منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں متحدہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں نے ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت

انتخابات میں جو طریقے استعمال کیے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے جمعیۃ علمائے ہند سے بعض ایسے وعدے کیے کہ مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی ایسے مذہبی اور سیاسی سوجھ بوجھ کے لوگ اس بساط پر مات کھا گئے۔ جمعیۃ علمائے ہند اور مسلم لیگ نے باہمی اشتراک سے یو۔پی کے تمام اضلاع میں الیکشن لڑا۔ انہی دنوں ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو امیر شریعتؒ حافظ محمد ابراہیم کی حمایت میں ضلع بجنور کا دورہ کر رہے تھے کہ بجنور میں مولانا حسرت موہانی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

امیر شریعتؒ ایک جلسہ میں تقریر کر رہے تھے کہ مولانا حسرت موہانی مخالف سمت سے خاصی جماعت کے ساتھ امیر شریعتؒ کی مخالفت کے لیے جلسہ گاہ میں آن پہنچے۔ عوام امیر شریعتؒ کی تقریر سے متاثر ہو چکے تھے، انہوں نے مولانا حسرت موہانی کی اس حرکت کو ناپسند کیا، اور قریب تھا کہ مجمع مولانا حسرت موہانی پر ٹوٹ پڑتا، امیر شریعت نے مداخلت کر کے مولانا حسرت کو بالاحترام سٹیج پر بٹھا لیا۔ تقریر جاری رہی۔ آخر جو لوگ مولانا حسرت کے ساتھ امیر شریعتؒ کی مخالفت کرنے آئے تھے، اس قدر نادم ہوئے کہ ان کے لیے یہاں سے واپسی مشکل ہو گئی۔

بجنور سے الہ آباد جاتے ہوئے اسٹیشن پر حضرت شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی سے امیر شریعتؒ کی ملاقات ہوئی۔ عقیدت، محبت اور احترام کے ملے جلے جذبات سے امیر شریعت نے آگے بڑھ کر حضرت سے مصافحہ اور معانقہ کرنا چاہا، لیکن حضرت مدنی نے جو ان دنوں مسلم لیگ کی حمایت کر رہے تھے، امیر شریعتؒ سے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:۔

"چونکہ آپ کا مسلک غلط ہے لہٰذا میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔"

اس پر امیر شریعتؒ کو دلی رنج پہنچا، اور حضرت مدنی سے عرض کیا:۔

"حضرت! اگر آپ حکم کریں تو میں اپنا یہ دورہ ملتوی کر کے پنجاب چلا جاؤں چونکہ آپ مسلم لیگ سے اشتراک کیے ہوئے ہیں، اور اپنے خادموں سے

ناراض ہیں، لیکن آنے والے کل کو آپ اپنے فیصلے پر خود نادم ہوں گے۔
مسلم لیگ سے آپ کا یہ اشتراکِ عمل سمجھ میں نہیں آیا، جبکہ کل تک آپ
خود ہمیں درس دیتے رہے ہیں کہ مسلم لیگ سرکار پرستوں کی ٹولی ہے۔
خیر! ..... آپ ناراض ہوں تب بھی میں نیاز مند ہوں۔"
اس گفتگو کے بعد امیر شریعت اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

انتخاب ختم ہونے پر مارچ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا جو پہلا اجلاس ہوا، اس میں تمام رجعت پسند ممبران شامل ہوئے۔ اس پر جمعیتہ علمائے ہند نے اعتراض کیا کہ جمعیتہ علماء اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ اس بنیاد پر تھا، کہ مسلم لیگ سے تمام رجعت پسند عناصر کو نکال دیا جائے گا، تو آج انتخاب کی کامیابی کے بعد ایسے عناصر کو پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں شامل کرنا اپنے وعدوں سے انحراف کرنا ہے۔

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کا دن ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کا دن تھا۔ کانگریس اور جمعیتہ علماء کے درمیان اس ایکٹ کے خلاف ہڑتال کرنے کا فیصلہ تھا، لیکن قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تمام شاخوں کو حکم دیا کہ وہ اس ہڑتال میں حصہ نہ لیں، اس پر جمعیتہ علماء نے قائد اعظم سے دریافت کیا کہ جب تمام سیاسی جماعتوں نے اس ایکٹ کی مخالفت کا فیصلہ کیا ہے تو آپ نے اس سے علیحدگی کا کیوں اعلان کیا ہے؟ اس پر صدر مسلم لیگ نے اپنے ایک پریس بیان میں کہا کہ جمعیتہ علماء الیکشن میں مسلم لیگ سے اشتراک کر چکی ہے تو انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ پارلیمانی پارٹی کے فیصلوں پر اعتراض کرے۔

اس بیان کا شائع ہونا تھا کہ جمعیتہ علماء نے مسلم لیگ کی عہد شکنی کی بنا پر علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان پڑھ کر امیر شریعت نے حضرت مدنی کو امرتسر سے مبارک باد کا برقی پیغام بھیجا۔

امیر شریعت ہمیشہ حضرت مدنی کا احترام کرتے رہے۔ حضرت مدنی کے دل میں بھی

امیرِ شریعت کی عزت رہی، لیکن مسلم لیگ کے اتحاد کے بعد جو خفت جمعیۃ علمائے ہند کو اُٹھانا پڑی، جمعیۃ کے رہنما امیرِ شریعت کے سامنے اپنے اس طرزِ عمل کی بناء پر ہمیشہ شرمندہ رہے۔

تحریکِ مدحِ صحابہؓ کا دورِ ثانی

۳۱-مارچ ۱۹۳۷ء کا غروبِ آفتاب اپنی کرنوں کے ساتھ وہ تمام الاؤ سمیٹ کر لے گیا، جن کی چنگاریوں نے ہندوستان کے ہر گھر میں آگ لگا رکھی تھی۔ بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا اور ماں سے بیٹی اپنی رائے کی بناء پر دشمنی کرنے لگی تھی۔ انتخابات ختم ہوئے تو ہُما پائی کا دامن سمٹ کر ان لوگوں کے آنگن میں لہرانے لگا، جنہوں نے مستقبل میں صوبوں کے راج سنگھاسن سنبھالنے تھے۔

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کا سورج اپنے جلو میں ایک ایسا قانون لے کر طلوع ہوا، جس سے فرنگی سامراج کی جگہ اپنے دیس کے لوگوں نے صوبائی خود مختاری کے تحت حکومتیں سنبھالیں۔ عوام کے نئے منتخب نمائندوں نے آگے بڑھ کر غیر ملکی آئین کو اپنی رائے کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ تو متحدہ ہندوستان کے بعض صوبوں میں انگریزی راج کی پیدا کردہ مشکلات نے انہیں آن گھیرا۔ ۱۹۰۴ء کا ذکر ہے کہ لکھنؤ کے شیعہ سنی اور ہندو مل کر تعزیے کا جلوس نکالتے تھے "اور یہ جلوس تال کٹورا کی کربلا میں ختم ہوتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں شیعہ حضرات نے اس ماتمی جلوس میں شامل ہونے والوں پر یہ قدغن لگا دی کہ تعزیہ کے جلوس میں برہنہ سر و پا شامل ہونا چاہیے۔ یہ شرط سنی عقیدہ کے مسلمانوں کے لیے تھی۔ کیونکہ شیعہ تو پہلے ہی ننگے سر اور ننگے پاؤں شامل ہوتے تھے۔ اس سے پیشتر سُنی عقیدہ کے مسلمان سر پر ٹوپی اور پاؤں میں جوتا پہنے جلوس کے ہمراہ چلتے تھے۔ نئے احکامات پر سُنّی مسلمانوں نے اعتراض کیا، تو حکومت نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنا علیحدٰہ کربلا بنا لیں۔ چنانچہ شہر سے آٹھ میل دور پھول کٹورا کے نام سے نئی کربلا تعمیر کی گئی۔ ۱۹۰۶ء کا محرم سُنّیوں نے اسی کربلا میں منایا۔ یہ بنیاد تھی لکھنؤ میں شیعہ سُنّی کے

مابین جھگڑے کی۔

۱۹۰۷ء میں رام پور کا شیعہ مولوی مقبول احمد نے جو دہلوی کہلواتا تھا۔ ایک اعلان کیا۔

"چونکہ حکومت کا اعلان ہے کہ وہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کرے گی، لہٰذا تبرّہ کہنا ہمارا مذہبی حق ہے، اور ہم تبرّہ کہیں گے۔ اس پر ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔"

اس اعلان سے سنی عقیدہ کے مسلمان برہم ہوئے، اور اس سال لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد ہوا۔ اس فساد کی بنا پر ۱۹۰۹ء میں حکومت یو۔پی نے ایک کمیشن مقرر کیا، جس نے اپنی رپورٹ کے آخر میں حکومت کو مشورہ دیا کہ:۔

"عشرہ محرم کے دن، چہلم کے موقعہ پر اور ۲۱۔ رمضان کے دن مدح صحابہؓ کی بندش کی جائے۔"

کمیشن کے اس مشورے پر حکومت نے اعلان کیا:۔

"کوئی شخص ایسے اشعار یا نظمیں یا دوسرے الفاظ جن میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی تعریف کی گئی ہو، یا ان کی مدح میں ہوں، تعزیوں میں یا کسی دوسرے اسلامی جلوس کے راستے پر نہ پڑھے، اور نہ ایسے مقام پر پڑھے، جہاں سے جلوس تک آوازہ پہنچ سکے، اور نہ کسی مجمع اور نہ کسی پبلک مقام پر ایسے مدحیہ اشعار اور نظمیں پڑھے۔

اگر کوئی شخص احکام مذکورہ کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ فوراً گرفتار کر لیا جائے گا، اور اس پر دفعہ ۲۹۸ یا کسی مناسب دفعہ تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔"

اس قسم کے ہنگامی اور مذہبی واقعات نے نئی حکومتوں کے راستے میں کانٹے بکھیرے اور مشکلات پیدا کیں۔

جون ۱۹۳۷ء کو یو۔پی میں نواب چھتاری نے بحیثیت مسلم لیگ کے جب اپنی عارضی گورنمنٹ ترتیب دی تو راجہ صاحب سلیم پور کو جو عقیدتاً شیعہ تھے، اپنی وزارت میں شامل کر لیا۔ ان کے عہدِ وزارت میں مدحِ صحابہ کا قضیہ جب ان کے سامنے لایا گیا، تو مصلحتاً انہوں نے یہ کاغذات آنے والی وزارت کے سپرد کرنا ہی بہتر سمجھا۔

یو۔پی میں باوجود کہ کانگرس اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی، لیکن ہنوز ان کے درمیان وزارتیں قبول کرنے میں اختلاف تھا۔ آخر چار ماہ کی مسلسل بحث کے بعد جب کانگرس نے عہدے قبول کرنے کا فیصلہ کیا تو نواب چھتاری کی وزارت مستعفی ہو گئی۔ مدحِ صحابہؓ کی تحریک نے انہیں ایسا پریشان کیا کہ کانگرس گورنمنٹ اس عقدہ کے حل کرنے میں ایسی الجھی کہ سلجھاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔ اس دوران شیعہ سنی اختلافات بڑھتے گئے

اس سال ۹۔محرم کو امیرِ شریعت لکھنؤ گئے تو انہوں نے شیخ شوکت علی وکیل کے احاطہ میں تقریر کے دوران عقیدہ اہلِ سنت رکھنے والے مسلمانوں سے صرف ایک سوال کیا:۔

"اس صوبہ میں آپ کا کوئی وارث ہے یا نہیں"؟

اس سوال کو ہی امیرِ شریعت نے اپنی تقریر کا عنوان بنا کر تین گھنٹے سنی عقیدہ کے مسلمانوں سے خطاب کیا۔

اس تقریر کے بعد مجلس احرار کے دوسرے رہنما چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن کئی بار لکھنؤ گئے۔ مولانا حسین احمد مدنی کی وساطت سے یو۔پی کانگرس حکومت سے رابطہ قائم کیا۔ لیکن حکومت خواہ کسی کی ہو، اس کا آستانہ اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس پر بغیر زینے کے چڑھنا دشوار ہے، اور یہ زینہ انسانی لاشوں سے تیار ہوتا ہے۔

شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے رہنماؤں نے کانگرسی حکومت سے وزیرِ اعلیٰ پنڈت گووند ولبھ پنت اور گورنر سر ہنری ہیگ سے متعدد بار گذارش کی کہ:۔

"لکھنؤ میں سُنّی مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی تعریف کریں، جبکہ یہاں ان کی تعداد اٹھاسی ہزار کے قریب ہے اور شیعہ حضرات صرف بارہ ہزار"

مگر حکومت، حکومت تھی۔ کسی کی نہ مانی۔ آخر ۱۰۔ جولائی ۱۹۳۷ء بروز جمعہ مجلس احرار نے کانگرسی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ اس تحریک میں قریباً پچیس ہزار مسلمان گرفتار ہوئے۔

آخر ۱۴۔ نومبر کو گورنر کے اعلان پر تمام قیدی رہا کر دیے گئے اور ۲۶۔ مارچ ۱۹۳۸ء کو سُنّی مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرتے ہوئے حکومت نے واضح طور پر اعلان کیا۔

"سنّیوں کا یہ حق ہرگز مابہ النزاع نہیں کہ آیا انہیں جلسۂ عام یا خاص مجلسوں میں خلفائے ثلاثہ کی مدح و ثناء کرنے کا حق ہے یا نہیں۔ بلاشبہ ان کو یہ حق حاصل ہے۔ جھگڑا صرف اس بات کا ہے کہ کس طریقے اور کن حالات پر ان کو لکھنؤ میں مدح صحابہؓ پڑھنی چاہیے۔

جب مختلف اقوام کے عقائد اور نقطۂ نظر میں فرق ہو تو گورنمنٹ کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ امنِ عامہ کو قائم رکھنے کے لیے مداخلت کرے اور عام لوگوں کی سہولت کا خیال کرے۔"

اس طرح یو، پی حکومت نے سنّی عقائد کے مسلمانوں کا مدح صحابہؓ کا حق تسلیم کرتے ہوئے ۱۹۰۹ء کے انگریزی اعلان کو ختم کر دیا۔

قتل کی سازش کا الزام

۱۹۳۸ء میں گو ہندوستان کے سیاسی حالات پرسکون نہیں تھے تاہم قانون شکنی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ہر سیاسی تنظیم اپنے حمایتوں کی تعداد کے لیے کوشاں تھی۔

مسلم لیگ اور کانگرس کے اختلافات جوان ہو کر دلوں کی جذباتی بھٹیاں روشن کر

کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ لڑائی مذہب سے لاتعلق تھی، تاہم سیاسی ضرورت کے تحت اس عمارت کی بنیاد مذہب پر اٹھائی گئی تھی۔ اس وقت ہندوستان کی سیاست دو دھڑوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ مسلم لیگ میں کافی تعداد مسلمانوں کی شامل تھی اور کانگرس سے ہندو اکثریت وابستہ تھی۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ دہلی کے اخبار ہفت روزہ "الامان" کے مدیر اعلیٰ مولانا مظہر الدین نے اپنے اخبار میں لکھا کہ:۔

"رات میں نے ایک خواب دیکھا ہے، ایک ہندو دیوی جو کھدر کے لباس میں ہے، اس نے مولوی حسین احمد کی پیشانی پر قشقہ لگایا ہے اور مولوی عطاء اللہ شاہ کے گلے میں جنیئو پہنایا ہے۔"

اس خواب کو مولانا مظہر الدین نے کارٹون کی شکل میں اپنے اخبار "الامان" میں شائع کیا۔ دن بھر یہ کارٹون اپنوں اور غیروں کے درمیان بحث کا موضوع بنا رہا، اور کچھ دنوں کے بعد ۱۴۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو ان کے دفتر میں انہیں قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کے الزام میں دو نوجوان محمد شفیق اور محمد احمد کو گرفتار کر لیے گئے۔

اس قتل کا پس منظر کیا تھا؛ لیکن پیش منظر میں یہ مقدمہ سیاسی نوعیت اختیار کر گیا چنانچہ دہلی کی مرکزی حکومت اور لکھنؤ فرنگی محل کے مولانا قطب الدین اس قتل کی سازش میں ملزمان سے یہ اقرار کرانے پر مصر رہے کہ اس قتل پر نوجوانوں کو آمادہ کرنے والے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی تھے، مگر ملزمان نے پیہم اصرار کے باوجود اس اقرار پر انکار کر دیا، البتہ ملزمان نے اپنے صفائی کے گواہان میں امیر شریعت اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا نام دیا۔ جب یہ دونوں حضرات عدالت میں تشریف لائے، تو ملزمان نے عدالت سے کہا:۔

"ہم ان بزرگوں کی صرف زیارت کرنا چاہتے تھے، گواہی کی ضرورت نہیں۔"

آخر اس مقدمہ کے فیصلے میں ایک نوجوان کو سزائے موت اور دوسرے کو عبور دریائے

شور کی سزا دی گئی۔

ضلع میانوالی کا دورہ

۱۹۱۴ء کی طرح ۱۹۳۹ء کا سال بھی یورپین قوموں کے مقدر عروج و زوال کا سال تھا۔ یورپ کے افق پر دوسری جنگ عظیم کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اس جنگ کے نتائج خواہ کچھ ہوتے، لیکن چوگانِ سیاست میں کھیلنے والے جانتے تھے کہ اگر اب کے برطانیہ جنگ میں الجھا تو وہ سورج جو اس کی سلطنت میں غروب نہیں ہوتا، وہ اس کو لے ڈوبے گا۔ اور یہ وقت تھا کہ برطانیہ پر ضرب کاری لگائی جائے اور پنجاب کے ایسے علاقوں میں جا کر لوگوں کو انگریزی فوج میں بھرتی ہونے سے منع کیا جائے، جو خالص فوجی علاقے کہلاتے ہیں، چنانچہ اگست ۱۹۳۹ء کے دوسرے ہفتے امیر شریعت اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ضلع میانوالی کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔

یہ زمانہ پنجاب میں سر سکندر کی وزارت کا تھا۔ اس کی یونینسٹ پارٹی "سروں" اور "رائے بہادروں" پر مشتمل تھی۔ انگریز کی کوکھ سے جنم لینے والے یہ لوگ انگریزی سائے کو رحمتِ خداوندی سے تعبیر کرتے تھے۔ انہیں جب پتہ چلا کہ امیر شریعت اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ضلع میانوالی کا دورہ کر رہے ہیں، تو حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آگئی۔

موت سے کھیلنے والے لوگوں کی سرزمین گوریت کے پہاڑوں تلے آباد ہے اگر پتھروں کے سے دل رکھنے والے جوانوں کی آبادی میں جب امیر شریعت نے توحید باری تعالیٰ اور برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کے پھول کانٹے بکھیرے تو ریتلی زمین کا دامن بھی ثمر آلود ہوا، اور خشک پہاڑوں سے امید بہار کی بو آنے لگی۔ رات جس گاؤں میں امیر شریعت تقریر کرتے گرد و نواح کی فضا کو رائفلوں کی آواز سے دہشت زدہ کر دیا جاتا۔ دن کو جن راستوں پر سفر کرتے انہیں ڈاکوؤں کی آماجگاہ بنا دیا جاتا۔ امیر شریعت کے ہمراہیوں کو ضلع کی پولیس نے اکثر پریشان کیا۔ مگر پر خطر ماحول میں پرورش پانے والے انسان ہر خطرے کو خود دعوت دے کر اپنے گرد جمع کر لیتے، اور یہی وہ زندگی ہے جو انہیں آخر کو منزل سے ہمکنار کرتی ہے۔

گرفتاری اس سنگلاخ وادی میں پندرہ دن گذار کر جب امیر شریعت واپس آئے، تو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہٹلر کی فوجیں پولینڈ، ناروے اور ڈنمارک سے گزر کر فرانس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ پنجاب میں یونینسٹ حکومت کو یہ بات پسند نہ آئی، کہ خالص عسکری علاقوں میں حکومت کے خلاف بغاوت کو پھیلنے دیا جائے، جبکہ انگریز براہِ راست جنگ میں شریک ہو چکا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی برستی ہوئی گھٹاؤں نے یورپ کی دلدل میں ایشیا کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہا۔ چنانچہ ہندوستان میں انگریزی پرچم کی آزاد اڑانوں کی نگاہیں ایسے لوگوں کی جستجو میں مصروف نظر آنے لگیں، جن کے ارادے اس جنگ کے منتظر تھے اور وہ انگریزی اقتدار سے نجات کے بہانے تلاش کر رہے تھے۔ آخر ڈیفنس آف انڈیا رولز کی نگاہِ اول نے امیر شریعتؒ کو تاک کر سب سے پہلا وار کیا، اور انہیں ۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ضلع مظفر گڑھ سے دفعہ ۱۲۱، ۲۰۲، ۴/۱۲ الف اور ۱۵۳ کے تحت سیشن جج راولپنڈی کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا۔

مجلس احرار کی قرارداد امیر شریعت کی گرفتاری کے ساتھ سارے ہندوستان میں سیاسی کارکنوں کی عام گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ کانگرس اور مجلس احرار ایسی سیاسی جماعتیں تھیں جنہوں نے ماضی قریب میں ہندوستان بھر میں اپنی سیاسی تاریخ کو اس نہج پر ترتیب دیا تھا کہ انگریزی راج ان سے متزلزل تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے متعلق فیصلہ کرنے کا انہی جماعتوں کو اختیار تھا، چنانچہ ۱۱۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو احرار ورکنگ کمیٹی نے امرتسر میں فیصلہ کیا۔

"مسلمانانِ ہند اس وقت تک اس جنگ میں حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے، جب تک کہ برطانیہ اسلامی ممالک سے اپنی فوجیں واپس نہ بلا لے، نیز ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد نہ کر دے۔

مجلس عاملہ کی رائے میں پھر یہ سوچنا باقی ہے کہ آیا ہمارے، برطانوی

فوج میں جانے سے انسانیّت کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔"
مجلسِ احرار کی اس قرارداد سے ایک طرف انگریزی سامراج برہم ہوا، تو دوسری طرف کانگرس کے حواس بھی درست نہ رہے۔ کیونکہ کانگرس ذہنی طور پر یہ سمجھتی تھی کہ اس کے بغیر اس جنگ کے متعلق کوئی دوسری پارٹی رائے دینے کی مجاز نہیں۔
مندرجہ بالا قرارداد نے امیرِ شریعت کے مقدمات پر بھی اثر ڈالا، اور عدالت نے انہیں ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ چوبیس روز کی مسلسل کارروائی کے بعد ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو یہ مقدمات سیشن جج راولپنڈی کے سپرد کر دیے گئے۔ لیکن قانون امیرِ شریعتؒ پر عائد کردہ تمام دفعات کی سچائی میں ناکام رہا، اور اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کے لیے ۱۸۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو لالہ موسیٰ ضلع گجرات میں ایک دوسرا مقدمہ ۱۱۷ اور ۲۰۲ کے تحت تیار کر لیا گیا۔ سرکاری استغاثہ نے امیرِ شریعت پر الزام لگایا کہ انہوں نے ۲۰۔ جون ۱۹۳۹ء کو لالہ موسیٰ میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:۔

"اب اسلام کی حکومت کہیں نہیں رہی اور مسلمانوں کو از سرِ نو حکومت سنبھالنی چاہیے، موجودہ حکومت میں مسلمان عورتوں کے نکاح کے فیصلے شیطان فرنگی کرتا ہے، اور اسلامی قانون کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ اور غیر دیانت دار یورپین مؤرخوں نے حکومت کے زیرِ اثر تاریخی واقعات کو غلط پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ عالمگیر اورنگ زیب پر الزام ہے کہ وہ ہر روز صبح ہندوؤں کے بارہ من جنیو اتارنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور حاضرین کی حوصلہ افزائی پر شاہ صاحب نے کہا کہ میں انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دوں گا اور ان کو اتنے زور سے سمندر میں دھکیل دوں گا کہ وہ پھر واپس نہ آ سکیں گے، سمندر کے پانی کو انگریزوں کے خون سے سرخ کر دوں گا، اور زمین کو بھی انگریزوں کے خون سے اس طرح سرخ کر دوں گا

جس طرح یزید نے امام حسینؓ کی فوجوں کو قتل کر دیا تھا۔
مرزا غلام احمد کافر ہے، اس نے برٹش گورنمنٹ کی پانچ سو گھوڑوں
سے امداد کی تھی"

گجرات ڈسٹرکٹ جیل میں اس مقدمے کی سماعت لالہ لکشمی داس مجسٹریٹ نے کی، دیوان چمن لال امیر شریعتؒ کی طرف سے سینئر وکیل تھے، ان کے علاوہ دوسرے قانون دانوں نے بھی امیر شریعتؒ کی حمایت میں اپنی کتب کے اوراق کھنگال ڈالے۔

۱۱۔ جنوری ۱۹۴۰ء کو امیر شریعتؒ مقدمے کی پیشی کے لیے عدالت کے کمرہ میں داخل ہونے لگے، تو کسی نے اشارے سے کہا شاہ جی! یہ ہے لالہ لدھا رام پولیس رپورٹر جس نے آپ کی تقریر کی ڈائری لکھی تھی، اور آج آپ کے خلاف عدالت میں پیش ہوگا اس پر امیر شریعتؒ نے نظر اٹھا کر لدھا رام کی طرف دیکھا، نیز اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بابو لدھا رام اس عدالت کے علاوہ ایک دوسری عدالت بھی ہے،
جہاں تم نے پیش ہونا ہے، شہادت دیتے وقت اس عدالت کا خیال
بھی رکھنا"

یہ فقرے کہہ کر امیر شریعتؒ عدالت میں داخل ہو گئے۔

ڈاکٹر عبدالقادر (گجرات) کا بیان ہے، جو اس مقدمہ میں امیر شریعتؒ کے معاون تھے، کہ سرکاری گواہ امیر شریعتؒ کے مندرجہ بالا فقروں پر آبدیدہ ہو گیا، اور دیر تک تنہائی میں خاموش کھڑا رہا۔

باب چہارم ـــــ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۰ء

ابتدائی کارروائی

انسانی ضمیر کے بیدار ہونے میں گاہ عمر گذر جاتی ہے اور گاہ آنسوؤں کی نمی اسے بیدار کر دیتی ہے۔ جب احساس جاگ اٹھتا ہے تو کھوئی ہوئی انسانیت تلاش کرنے میں انسان کو دقت نہیں ہوتی۔

امیر شریعتؒ کے الفاظ سرکاری گواہ لدھارام کی کایا کلپ کر گئے۔ انگریزی سلطنت کا ہیڈ کانسٹیبل درویش کے ایک فقرے پر زندگی کی ساری آسائشیں برباد کر بیٹھا۔

استغاثہ کی ابتدائی شہادت ہیڈ کانسٹیبل لدھارام کی تھی، جس نے ۲۸ جون ۱۹۳۹ء کو لالہ موسیٰ میں امیر شریعتؒ کی تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے تھے۔ جب وہ بطور چیف رپورٹر ۱۱ جنوری ۱۹۴۰ء کو ڈسٹرکٹ جیل گجرات میں لکشمی داس کی عدالت میں پیش ہوا تو امیر شریعت کی طرف سے دیوان چمن لال ایڈووکیٹ (ایم۔ ایل۔ اے) میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ (ایم۔ ایل۔ اے) اور مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ بطور وکیل پیش ہوئے۔ لدھارام نے حسب ذیل ابتدائی بیان دیا:

"میں نے ۲۸ جون ۱۹۳۹ء کو اس جلسہ میں شرکت کی تھی، جو گرانڈ ٹرنک روڈ کے قریب لالہ موسیٰ میں ہوا تھا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اس جلسہ میں تقریر کی تھی لیکن مجھے یہ بات یاد نہیں کہ شاہ صاحب کے علاوہ کسی اور شخص نے بھی تقریر کی تھی یا نہیں۔ میں نے شاہ صاحب کی تقریر کا خلاصہ لکھا تھا جس کتاب پر حروف "پی۔ ڈی" تحریر ہے اس میں تقریر کا اردو خلاصہ درج

ہے، اور میرے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، لیکن یہ خلاصہ دراصل اس تقریر کا
نہیں ہے جو شاہ صاحب نے کی تھی، بلکہ یہ تقریر کا مسخ شدہ خلاصہ ہے،
جو میں نے تقریر کے وقت نہیں، بلکہ تقریر کے بعد کیا تھا، اصل تقریر کا
خلاصہ جلا دیا گیا تھا۔

تقریر پیشِ نظر کا خلاصہ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کی ہدایت پر میں نے گجرات
میں ان کے مکان پر مرتب کیا تھا اور دوسرے روز میں نے اسے مفصل عبارت
میں منتقل کیا۔"

اس مرحلے پر استغاثہ نے عدالت سے درخواست کی کہ اسے قانونِ شہادت کی دفعہ
۱۵۴ کے تحت گواہ پر جرح کرنے کی اجازت دی جائے۔ مختصر بحث کے بعد عدالت نے
یہ درخواست قبول کر لی۔ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کی جرح کے جواب میں گواہ نے کہا،۔

"میں نے یہ خلاصہ تقریر کے تین روز بعد مرتب کیا تھا۔ مجھے وزیرِ اعظم پنجاب
(سر سکندر حیات) کا ایک خط دکھایا گیا تھا، جس میں مجھے پروسیکیوٹنگ انسپکٹر
کے مکان پر حاضر ہونے کی ہدایت کی گئی تھی، میں نے اس کی تعمیل کی، اس
خط میں تحریر تھا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو تم پروسیکیوٹنگ
کے مکان پر پہنچو، لیکن اس خط میں وہاں پہنچنے کی تاریخ معین نہیں کی
گئی تھی۔ یہ خط ٹائپ کیا ہوا تھا اور مجھے اصل خط دکھلایا گیا تھا۔ میں نے اپنی
واقفیت کے لیے اس خط کا ترجمہ کر لیا تھا۔ استغاثہ کے دو گواہ جنہوں نے
تقریر کے اس خلاصے پر دستخط کیے تھے، میرے ساتھ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر
کے مکان پر نہیں گئے تھے۔ خط میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ تقریر کا خلاصہ
پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مشورے پر مرتب کرنا چاہیے۔

یہ خط ۲۸ - جون ۱۹۳۹ء کا لکھا ہوا تھا۔ اس پر نمبر سی، آر، پی، بی ۸، ۷ ایل

(C.R. P.B. 78. L) تھا۔ یہ خط ۲۰ جون کو ہی گجرات پہنچا تھا۔ خط میں یہ ہدایت بھی درج تھی کہ اس خط کو خفیہ تصور کرنا چاہیے۔ اس بناء پر میں نے کسی دوسرے پولیس افسر کو اس بات کی اطلاع نہیں دی کہ میں نے تقریر کا خلاصہ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مشورے سے مرتّب کیا ہے۔ کیونکہ مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ مجھے ترقی دی جائے گی، اور مجھے کام کی عمدگی کی سالانہ سند دی گئی تھی، اس لیے میں نے تقریر کے خلاصہ کو مسخ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس سلسلے میں مجھے نقد انعام بھی دیا گیا تھا، لیکن مجھے یہ بات یاد نہیں کہ انعام کی صحیح رقم کیا تھی؟

شہادت کے دوران دیوان چمن لال نے چند کاغذات لدھا رام کو دیے جنہیں گواہ نے عدالت میں پیش کیا۔ ان کاغذات میں گواہ نے اپنے اس نظریہ کی وضاحت کی تھی، جس کی بناء پر اب وہ پولیس کی ملازمت سے مستعفی ہو چکا تھا۔ اس استعفے کو عدالت نے پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے کہنے پر ایگزیبٹ پی، ڈبلیو ۱/۲ کر لیا۔ جو حسب ذیل ہے۔

جناب عالی!

میں اڑھائی سال سے محکمہ پولیس میں کام کر رہا ہوں۔ میری ڈیوٹی پولیس رپورٹر کی ہے۔ میں کئی دفعہ اپنے ضمیر کے خلاف کام کرتا رہا ہوں، وہ محض اس لیے کہ افسرانِ بالا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ان کو خوش رکھوں۔ مگر آخرکار مجھے اپنے ضمیر نے بیدار کیا اور میں اپنے ضمیر کا خون نہ کر سکا جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں آج عدالت میں بالکل درست، اصل اور قدرتی چیز پیش کر رہا ہوں۔ چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مقدمے کے اصل حالات حسب ذیل ہیں:"

"آنریبل سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب کی طرف سے چند ایک مراسلات

اُن کے "پی۔اے" کی معرفت سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کو پہنچے، جن میں سے بعض حکموں پر میری تعمیل کرائی گئی۔

سب سے پہلی چٹھی مورخہ ۲۹/۱/۴ نمبر سی۔آر۔پی جس میں سید عطاء اللہ بخاری کی نگرانی کے لیے تحریر تھا، جس میں مسٹر بی، ایس، برا سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کو لکھا گیا تھا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سکنہ ناگڑیاں ضلع گجرات جب تمہاری حدود میں پہنچے، تو اس کی تمام حرکات و سکنات کی نگرانی کی جائے۔ اور ایک اچھے ہوشیار رپورٹر کی ڈیوٹی اس کے ساتھ لگادی جائے، وہ محتاط ہوکر اس کی نگرانی کرے، اور نگرانی کنندہ کا نام وغیرہ اس چٹھی میں درج کیا جائے۔" اس چٹھی کی تعمیل میں مجھے سید عطا اللہ بخاریؒ کی نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا اور بذریعہ چٹھی نمبر اے ۱۰۲ مورخہ ۲۹/۱۱/۴ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی طرف سے مندرجہ ذیل جواب وزیر اعظم کے "پی۔اے" کی معرفت بھیجا گیا۔

جناب عالی! تعمیل حکم حضور والا شائع ہوگئی ہے۔ اور ایک اچھا ہوشیار رپورٹر ان کی نگرانی کے لیے منتخب کیا گیا ہے، جس کا نام لدھا رام ہے۔ اور پڑھا لکھا کانسٹیبل ہے۔ انگریزی خواندہ ہے۔"

اس کے بعد مندرجہ ذیل چٹھی "پی۔اے" سر سکندر حیات کی طرف سے ۱۱۔جون ۱۹۳۹ء کو سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کے نام آئی۔ اس چٹھی کا نمبر C.R.P/86376 تھا۔" آپ کو تحریر کیا جاتا ہے کہ ہمیں خفیہ طور پر اطلاع ملی ہے کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری تمہارے ضلع گجرات میں یونینسٹ وزارت کے خلاف پروپیگنڈے کے لیے جا رہا ہے۔ آپ ایک ہوشیار باختیار رپورٹر کو حکم دیں کہ وہ اس کی تقریروں کے نوٹ لکھ کر آپ کے سامنے پیش کرے، اور ممکن ہو تو بہت کشادہ لفظ لکھے جاویں۔ اس حکم کو نہایت

خفیہ حکم تصور کیا جائے، اور بعد کرانے تکمیل رپورٹر ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ ضروری ہے۔"

اس چٹھی کے جواب میں مورخہ ۲۲ جون ۳۹ کو چٹھی B-106 کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ گجرات نے سر سکندر حیات خان کو ان کے "پی۔ اے" کی معرفت اس مضمون کی چٹھی لکھی۔

"بجواب حکم B. 511. L عرض کی گئی ہے کہ لدھارام رپورٹر کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے اور اس کو خاص ہدایت کی گئی ہے کہ وہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں کے نوٹ لیتے وقت کشادہ طور پر لکھے، اور ہمارے روبرو پیش کرے اور پیر غازی میں ایک جلسہ ہونے والا ہے، جس میں کہ اسے خاص ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کھلے طور پر نوٹ کرے جو کہ ڈائری علیحدہ ارسال ہو گی۔"

اس چٹھی کے بعد موضع پیر غازی وغیرہ میں جلسے ہوئے جن میں شاہ صاحب نے بالکل مذہبی تقریریں کیں۔ میں نے ان کو کشادہ لکھنا موزوں نہ سمجھا کیونکہ ان میں کمی بیشی کر کے مقدمہ چلانے کی گنجائش نہ تھی۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے میری طلبی کی۔ میں نے جواب میں کہا کہ تقریریں بالکل مذہبی تھیں ان کو کشادہ لکھنا بے سود تھا۔

اس کے بعد سر سکندر حیات کے پرسنل اسسٹنٹ نے ۲۸۔ جون ۱۹۳۹ء کو چٹھی نمبر C.R.P / B.7806 کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ ضلع گجرات کو لکھا۔

"ڈائری خفیہ از موضع پیر غازی اور مدینہ پہنچ چکی ہے، چونکہ ان میں مذہبی لیکچر تحریر ہے، جس میں اتنی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، لہٰذا آئندہ ڈائری کوئی بھی ہو جس میں پولیٹیکل اظہار ہو اس میں تقریر کو اس طرح پر بعد لینے کے لیے بحکم پروسیکیوٹنگ انسپکٹر بنایا جائے کہ وہ تقریر زیر دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہند یا

کسی قتل کی تبلیغ کے جرم میں مثلاً ۳۰۲/۱۱۷ کا مرتکب ہو سکے، اور یہ بھی خیال رکھا جائے کہ ساتھ ۱۲۴ا/۱۵۳ بھی قائم رہے اور گواہان خاص طور پر معتبر اور اچھے پولیس کے اثر والے ہوں، اس حکم کو نہایت خفیہ تصور کیا جائے۔"

اس حکم کی وصولی کے بعد مورخہ ۲۸/۷/۴۹ کو شاہ صاحب نے لالہ موسیٰ ضلع گجرات میں تقریر کرنے کے لیے آنا تھا۔ چنانچہ حسب سابق مجھے رپورٹ لینے کے لیے متعین کیا گیا۔ شاہ صاحب نے تاریخ مقررہ پر لالہ موسیٰ میں تقریر کی، اور میں نے اس تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے اور ان میں کچھ کشادہ جگہ موجب ہدایت افسران بالا رکھی اور تقریر کے لونگ ہینڈ نوٹ کے بغیر ہی گجرات واپس آیا اور پروسیکیوٹنگ انسپکٹر نے کشادہ جگہ کو ناکافی خیال کیا اور مجھے کہا کہ میں اس تقریر کو لونگ ہینڈ میں لکھ دوں۔ میں نے تعمیل حکم "پی، آئی" صاحب کی۔ اور "پی، آئی" صاحب نے لونگ ہینڈ کی عبارت میں اپنے حسب منشا تبدیلیاں اور اضافے کیے۔ اس کے بعد چونکہ ۲۸ تاریخ والی کاپی کی تحریر تبدیلیوں اور اضافوں کے باعث مشکوک ہو گئی تھی اور اسے عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے "پی، آئی" صاحب نے حکم دیا کہ نئی کاپی پر تبدیل شدہ عبارت، شارٹ ہینڈ اور لونگ ہینڈ میں تحریر کی جائے۔

نئی کاپی مورخہ ۳۰/۷/۴۹ کو صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر پولیس کے سٹینو سے حاصل کی گئی، اور اس پر تمام عبارت شارٹ ہینڈ اور لونگ ہینڈ نوٹ کرنے کے بعد ۲۸/۷/۴۹ والی اصل کاپی کو بحکم "پی، آئی" صاحب نذر آتش کر دیا۔ اور اس نئی کاپی کی بنا پر مقدمے کی منظوری حاصل کی گئی، اور یہ مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ اصلی ڈائری اور موجودہ ڈائری (جعلی) کے چند ایک

اختلافات میں یہاں نوٹ کرتا ہوں، جن سے معلوم ہو سکے گا کہ کس طرح حکّام بالا کے احکام کی ناجائز تعمیل کی گئی ہے۔

موجودہ ڈائری میں جو کچھ تحریر کیا گیا۔

۱۔ ساڈیاں بیٹیاں دے نکاح تے ساڈے نکاح دے فیصلے شیطان فرنگی کردا اے، اتے ساڈی شریعت دا کوئی خیال تے لحاظ نہیں کردا۔

۲۔ یہ ان بے ایمان فرنگیوں اور سکندر کی متعصبانہ چال ہے۔

۳۔ میں حیران ہوں کہ یہ فرنگی، خدا ان کو غارت کرے کیوں نہیں جاتے؟

۴۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زیادہ نہیں، صرف جتنے آدمی یہاں موجود ہیں، میرے ساتھ ہو جائیں۔ میں اس حکومت کا تختہ پلٹ دوں، ان کے پرچے اڑا کر رکھ دوں اور ان ڈشٹوں کو بحر میں جا کر ایسا دھکا دوں کہ نظر نہ آئیں۔ مجھے اس وقت بھی اگر تمہارا حوصلہ ہو اور تیر و کمان و تیغ بکف ہو کر ان فرنگیوں کے خون کی نہریں بہا دوں، ان کے خون سے سمندر لال کر دوں۔ ان کے خون سے زمین سیراب کر دوں، جس طرح یزید نے حسینؓ کی فوج کو تہ تیغ کیا تھا، اسی طرح ان شیطانوں کو کاٹ دو، حوصلے سے کام لو اور ان بے ایمان کافروں کو نکال دو۔"

تلف شدہ ڈائری میں جو کچھ تحریر تھا۔

۱۔ ساڈے نکاح تے ساڈی بیٹیاں دے نکاح دے فیصلے غیر مسلم کرن، ساڈی شریعت دا کوئی خیال تے لحاظ نہ ہووے۔

۲۔ نہیں، بلکہ یہ سکندر اور یونینسٹ پارٹی کی مہربانی اور چال ہے۔

۳۔ میں حیران ہوں کہ باوجود سردار دھنا سنگھ کی مسجد بنوانے پر بھی سکھ صاحبان کے دل سے کدورت اور برا خیال کیوں نہیں جاتا، اور یہ اتفاق

کیوں نہیں کرتے۔

۴۔ یہ الفاظ صرف پی آئی صاحب نے بحکم سر سکندر حیات خاں مندرجہ اپنی طرف سے لکھوائے، جو بالکل جھوٹ ہیں اور ایک بے گناہ ہستی کو گناہ عظیم کا موجب بناتے ہیں۔ یہ الفاظ قطعاً مقرر نے اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیے۔

اس طرح مقدمہ تیار کرنے کے بعد اور ۳۰۲/۱۱۷ تعزیرات ہند کا مواد مہیا کرنے اور ساتھ ہی ۱۲۴/۱۵۳ کا خیال رکھنے کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات نے سر سکندر حیات کو ان کے "پی اے" کی معرفت اپنی چٹھی نمبر ۷ - ۱۰۶ مورخہ ۳۰/۹/۲ میں اپنی کارکردگی اور تعمیل ارشاد کی حسب ذیل اطلاع دی۔

"جناب عالی!

مورخہ ۷/۹/۲۸ کو عطا اللہ نے لالہ موسیٰ میں تقریر کی، جس کے متعلق رپورٹر کو خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی۔ مطابق ہدایت "پی۔ آئی" صاحب کے پاس ڈائری کو بھیجا گیا، اور اس میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ڈائری اور مرتب کی گئی۔ جس میں قانونی اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے کمی بیشی کی گئی اور ایسے الفاظ ایجاد کیے گئے جن پر فوراً ۳۰۲/۱۱۷ تعزیرات ہند عائد ہوتی ہے اور بعد شہادت استغاثہ ۱۲۱ تعزیرات ہند بھی قائم ہو سکتا ہے ۳۰۲/۱۱۷ تعزیرات ہند کے لیے صرف الفاظ تبلیغ قتل اقوام انگریز اور پبلک میں کافی استعمال لکھا گیا ہے۔ لہٰذا بموجب حکم تعمیل ہو کر رپورٹ عرض ہے۔"

وزیر اعظم سے لے کر نچلے افسروں تک کی تمام کارروائی کا حال مذکورہ بالا خط و کتابت اور جعلی ڈائری نویس سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس پر مزید کسی تنقید

کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی منصف مزاج انسان اس بارے میں
کسی تنقید کا محتاج ہوگا۔

اب میرے سامنے کئی روز سے یہ سوال درپیش ہے کہ آیا میں اس
طرزِ عمل کو قبول کرتا جاؤں جو کہ اب تک جاری ہے اور جس کے ذریعے
دنیاوی طور پر فائدہ اور ترقی کی امید ہے، اور اس جعلی ڈائری کی ترتیب میں
جو خدمت مجھ سے لی گئی ہے، اس کے صلے میں $\frac{9}{49}$ ۸ کو پچیس روپے
نقد انعام اور ایک عدد سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد مزید ترقی و انعام
اکرام کے لالچ میں جیسا کہ مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ میں ضمیر فروشی کرتا جاؤں
یا دوسروں کے خون سے ہاتھ رنگین کرنے سے باز نہ آؤں خواہ اس میں دنیاوی
زر و مال کی کمی ہی کیوں نہ ہو۔ میرے دل نے بیحد کشمکش اور شب و روز
کے غور و فکر کے بعد یہی فیصلہ کیا ہے کہ میں بڑے بڑے افسران کا آلۂ کار
بن کر اپنے ضمیر کا خون نہ کروں اور جس محکمہ میں اس قسم کی بے ایمانی اور ضمیر فروشی
کے بغیر ترقی کا راستہ نہیں مل سکتا، اس کو خیرباد کہتا ہوا اپنے گناہوں سے
توبہ کروں اور اپنے آپ کو خدا کے بھروسے پر چھوڑ دوں۔ بدیں حالات
میں ملازمت سے مستعفی ہوتا ہوں۔"

لدھا رام بقلم خود

مندرجہ بالا بیان کے بعد گواہ پر مفصل جرح کی گئی اور یہ کہ اس نے نوٹ بک کس
طرح حاصل کی تھی۔ اس سلسلے میں لدھا رام نے بیان میں کہا:۔

"میں نے ۴۔ نومبر ۴۹ ۱۹ء کو مقدمہ کی پہلی سماعت کے موقعہ پر جب
شاہ صاحب کو دیکھا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں ایک بیگناہ
شخص کو مصیبت میں پھنسا رہا ہوں، مجھے خدا کے سامنے اس فعل

کا جواب دینا ہوگا۔ چنانچہ میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ اگر کسی وجہ سے آج میری شہادت نہ ہو سکی تو میں اس راز کو جو ابھی تک میرے سینے میں محفوظ ہے طشت از بام کر دوں گا، لیکن اگر آج میں شہادت سے نہ بچ سکا، تو گواہی دینے کے بعد خودکشی کر لوں گا۔ میں ۲۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو رخصت پر چلا گیا تھا۔ اور آج اس مقدمے کی سماعت کے موقعہ پر حاضر ہوں۔ میں آج ہی لاہور سے کرائے کی ایک موٹر کار میں یہاں پہنچا ہوں۔ میں تنہا آیا ہوں۔ میں نے دو آنے تین پائی فی میل کے حساب سے کرایہ ادا کیا ہے۔ میں ڈرائیور کا نام نہیں جانتا۔ لیکن وہ جیل کے دروازے کے باہر موجود ہے میں گذشتہ اڑھائی سال سے محکمہ پولیس میں ملازم ہوں۔

مجھے چند خفیہ خطوط بھی دکھائے گئے۔ اگر عدالت مجھے اس بات کا یقین دلائے کہ ان خطوط کے مضامین کو منظرِ عام پر لانے کی پاداش میں مجھ پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا، تو میں ان کو منظرِ عام پر لانے کے لیے تیار ہوں۔"

گواہ نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"میں اس سے پہلے اپنے ضمیر کو ذبح کرتا رہا ہوں، لیکن آئندہ اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

اس کے بعد گواہ نے اس بات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ میں کس طرح اس مقدمہ میں شہادت دینے سے گریز کرتا رہا۔ نیز پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کا منشا بھی یہ تھا کہ میں شہادت نہ دوں۔ کیونکہ انہیں کسی طرح میرے ارادے کا پتہ چل گیا تھا۔ گواہ نے کہا:۔

"میں ۲۰۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر گیا۔ جہاں

مجھ سے کہا گیا کہ تمہیں تار کے ذریعے چھٹی لینی چاہیے۔"

شاہ صاحبؒ کے وکیل کی جرح کے جواب میں گواہ نے کہا:۔

"میں ایک یا ڈیڑھ سال سے پولیس رپورٹر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ مختصر نویسی کی کتابیں پولیس کے دفتر میں رہتی ہیں، جب ایک کتاب ختم ہو جاتی ہے تو اسے پولیس کے دفتر بھیج کر دوسری منگوالی جاتی ہے۔ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ شاہ صاحب کی تقریر کے خلاصہ کو پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس لے جاؤں۔ مجھے وزیر اعظم کے حکم میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ شاہ صاحب کی تقریر کا خلاصہ لکھتے ہوئے الفاظ کے درمیان خالی جگہ چھوڑتا چلا جاؤں۔ یہ خط جس میں مذکورہ بالا ہدایت درج تھی۔ وزیر اعظم کے پرسنل اسسٹنٹ کی جانب سے تھا۔ ایسے تمام خطوط جو پولیس سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں موصول ہوتے ہیں، ایک رجسٹر میں درج کر لیے جاتے ہیں۔ یہ رجسٹر صیغہ راز میں ہوتا ہے اور کسی ایسے شخص کو جس سے اس امر کا کوئی تعلق نہ ہو نہیں دکھایا جاتا۔ میں ان خطوط کا خلاصہ اس لیے اپنے پاس لکھتا رہا کہ اس میں میرے لیے ہدایات درج تھیں۔"

اس موقعہ پر گواہ نے خطوط سے متعلق اپنی یادداشتیں پیش کیں، اور اپنے بیان کو مزید جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"وہ نوٹ بک جس میں شاہ صاحب کی تقریر کا صحیح خلاصہ درج تھا ۲۸۔دسمبر کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے اپنے مکان پر جلا دی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، شاہ صاحب نے اپنی تقریر میں کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی، جس کی بناء پر ان کے خلاف ۳۰۲/۱۱۷ اور ۱۲۱ قانون ضابطہ فوجداری کے تحت مقدمہ چلایا جا سکے۔"

بیان کے آخری حصے میں گواہ نے کہا:۔

"لاہور سے گجرات آتے ہوئے آج راستہ میں مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ میری گرفتاری کے لیے جہلم یا گجرات سے وارنٹ جاری ہوئے ہیں۔ جب میں ڈسٹرکٹ جیل کے احاطہ میں دیوان چمن لال سے ملا، تو ان سے امداد کی درخواست کی" اور عدالت کے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے چند کاغذات اور ایک خط انہیں دے دیا۔

یہ میرا استعفیٰ تھا، جب میں ڈسٹرکٹ جیل کی عدالت کے کمرہ میں داخل ہو رہا تھا، تو دیوان چمن لال نے عدالت کے سامنے استعفیٰ اور دوسرے خطوط مجھے واپس کر دیے۔

میں مجسٹریٹ کے ساتھ ساتھ سب جیل تک آیا ہوں۔ کیونکہ میں حفاظت کا متمنی ہوں۔ عدالت کے کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے میں نے دیوان چمن لال صاحب سے کہا تھا کہ وہ عدالت سے درخواست کریں کہ وہ مجھے بطور گواہ پیش ہونے کے لیے اپنی حفاظت میں لے لیں۔

۲۸۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے مجھ سے دوسری ڈائری تیار کرنے کے لیے کہا تھا کہ اس مسودہ کے جس پر حروف پی آئی لکھے ہوئے ہیں اصفحہ ۲۴ پر جن لوگوں کے دستخط موجود ہیں، وہ ان کی موجودگی میں دوبارہ دستخط کرا سکیں۔

۸۔ جنوری ۱۹۴۰ء کو اپنی ملازمت پر واپس آ رہا تھا کہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر مجھے وزیر آباد ریلوے سٹیشن پر ملے۔ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میرے ساتھ کوئی تھا یا نہیں۔ بندرا نارائن میرا عزیز ہے اور لاہور کے قیام کے دوران میں اسی کے پاس ٹھہرا تھا۔

اس شہادت کے بعد مقدمہ ۲۳۔جنوری پر ملتوی ہو گیا۔

شہادت کے بعد جب لدھارام عدالت سے باہر آیا تو بخشی آنند رام اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس نے ان سے ایک نوٹس کی تعمیل کرائی، جس میں تحریر تھا کہ چھٹی منسوخ ہو جانے کے بعد کیونکہ تم بر وقت اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے حاضر نہیں ہوئے، اس لیے تمہیں معطل کیا جاتا ہے۔

لدھارام :"میں مستعفی ہو چکا ہوں"

اس طرح مقدمہ کے حالات و واقعات نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ دوسری صبح کے اخبارات نے جلی سرخیوں کے ساتھ اس مقدمہ کو شائع کیا، نولا اینڈ آرڈر کے تحفظ کے لیے سرکاری قانون اپنی حفاظت میں لیس ہو کر سامنے آگیا ۱۲۔ فروری ۱۹۴۰ء کو ایڈووکیٹ جنرل مسٹر سلیم نے ہائیکورٹ میں درخواست دی کہ

"اس مقدمہ کو ہائی کورٹ میں منتقل کر دیا جائے۔ کیونکہ لدھارام گواہ استغاثہ نے وزیر اعظم پنجاب کو جو لا اینڈ آرڈر کے مالک ہیں اس مقدمہ میں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا کسی ماتحت عدالت پر اس معاملہ کا فیصلہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

چنانچہ جسٹس اسکیمپ نے درخواست کی سماعت کے بعد یہ مقدمہ ہائیکورٹ میں منتقل کر دیا۔

ماتحت عدالت سے فارغ ہو کر لدھارام گواہ کو یقین تھا کہ پولیس انہیں گرفتار کر لے گی لیکن امیر شریعت کے وکیل دیوان چمن لال ایڈووکیٹ نے لدھارام کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی کار کے قریب لے آئے کہ اتنے میں ڈی۔آئی۔جی پولیس نے کہا "میرے پاس لدھارام کے دفعہ ۲۹ کے وارنٹ ہیں اور انہیں گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔"

دیوان چمن لال نے کہا: "آپ انہیں گرفتار نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ اب ملازمت سے مستعفی ہو چکے ہیں۔"

پولیس آفیسر کو گمان ہوا کہ ممکن ہے کوئی قانونی شق ایسی ہو کہ میں انہیں گرفتار نہیں کر سکتا، ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ دیوان چمن لال جلدی سے لدھا رام کو اپنی کار میں بٹھا کر لے اڑے پولیس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا؟

لدھارام کی تلاش

پنجاب پولیس نے اپنے مجرم کی تلاش میں مجالس احرار کے دفاتر، سیاسی کارکنوں کے مکان اور دیگر پولیٹیکل پارٹیوں کے ٹھکانوں پر مسلسل چھاپے مارے اگر نامرادیوں کے سوا انہیں کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر لدھا رام کہاں غائب ہو گیا؟ اپنے تمام وسائل کے باوجود پنجاب پولیس اس سے بے خبر رہی۔

ہائی کورٹ میں

ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر سر ڈگلس ینگ اور پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات کے درمیان تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ احرار رہنماؤں نے اس سے استفادہ کرنے کے لیے دہلی کے مشہور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ مسٹر آئر کی معرفت چیف جسٹس سے ملاقات کی راہ نکالی، نیز سر ڈگلس ینگ نے بھی کسی محفل میں اس ارادے کا اظہار کیا کہ:۔

> "اگر آپ مجھے مطمئن کر دیں کہ سر سکندر حیات نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خلاف ذاتی رنجش کی بناء پر در پردہ سازش کر کے مقدمہ چلایا ہے تو میں سید صاحب کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔"

چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، ڈاکٹر عبد القوی لقمان کی معیت میں صبح پانچ بجے ٹیکسی کار کے ذریعے جسے ایک سکھ ڈرائیو کر رہا تھا، سر ڈگلس ینگ کی کوٹھی کے عقبی دروازے پر پہنچے۔ سر ڈگلس ینگ پہلے سے منتظر تھے۔ وہ مولانا کو اپنے خاص کمرہ میں احترام سے لے گئے۔ ڈاکٹر عبد القوی لقمان کے توسط سے مولانا اور مسٹر ینگ کے درمیان گفتگو ہوئی۔

مولانا نے سر سکندر حیات کے پرسنل اسسٹنٹ کے خطوط کی تصاویر دکھائیں۔

گو یہ ملاقات بڑی محتاط اور مخفی طریق سے تھی، لیکن سی آئی ڈی کو پتہ چل ہی گیا کہ احرار رہنماؤں اور ینگ کے درمیان ملاقات ہوئی ہے۔ آخر ۱۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ اور رائے بہادر جسٹس رام لال پر مشتمل ڈویژنل بنچ کے روبرو زیر دفعہ ۱۲۴ الف بغاوت، دفعہ ۱۵۳ ملک معظم کی رعایا کے درمیان منافرت پھیلانے، دفعہ ۳۰۲-۱۱۷ تعزیرات ہند قتل کی انگیخت وغیرہ الزامات کے تحت مقدمہ پیش ہوا۔ اس موقع پر امیر شریعت کو لاہور سنٹرل جیل سے پولیس کی خاصی تعداد کے حراست میں بغیر ہتھکڑی کے ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا۔

اس موقعہ پر سینکڑوں کی تعداد میں لوگ عدالت کے صحن میں جمع تھے۔ عدالت کے باہر اور ہائی کورٹ کے صحن میں پولیس کا کڑا پہرہ تھا۔

سرکار کی طرف سے مسٹر محمد سلیم ایڈووکیٹ جنرل اور مسٹر منیر احمد سینئر ایڈووکیٹ جنرل عدالت میں موجود تھے۔ جبکہ امیر شریعت کی طرف سے میاں عبدالعزیز، دیوان چمن لال، مسٹر کے ایل گابا بیرسٹر، مسٹر بدرالسلام ایڈووکیٹ، مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ اور مسٹر عبدالقیوم وکیل لائل پور پیروکار تھے۔

اس مقدمہ میں استغاثہ کی طرف سے ۱۱، ۱۲ مارچ کی کارروائی کے دوران چھ سرکاری گواہان نے عدالت میں بیان دیے۔ آخری اور اہم گواہ لدھارام تھا، جس کے لیے مقدمہ یکم اپریل پر ملتوی کر دیا گیا۔

لدھارام

پانچ فٹ چھ انچ قد، سفید رنگ کے ساتھ دوہرا اور گٹھیلا جسم، خوبصورت نقش و نگار یہ تھا چوبیس سالہ نوجوان مسٹر لدھارام، والد کا نام امیر چند تارنگر اور ہ ضلع سرگودھا کے چک ۶۶ میں پیدا ہوئے، اور سناتن دھرم ہائی سکول گجرات سے میٹرک کرنے کے بعد لاہور ڈی۔ اے۔ وی کالج سے ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ گجرات پولیس میں

بطور ہیڈ کانسٹیبل بھرتی ہوئے۔ اوپر کے افسروں میں اس قدر اعتماد حاصل کیا کہ ضلع کی ہر سیاسی ضرورت کے لیے انہیں استعمال کیا جاتا رہا۔

۱۱- جنوری ۱۹۴۰ء کو جب وہ پہلی بار امیر شریعتؒ کے مقدمہ میں چیف رپورٹر کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے اور عدالت نے انہیں منحرف گواہ قرار دے دیا تو دیوان چمن لال اور میاں عبدالعزیز انہیں لاہور لے آئے۔ وہ قریباً ایک ہفتہ مولانا مظہر علی اظہر کے مکان واقع ریلوے روڈ میں رُوپوش رہنے کے بعد کیلاش پور (سہارن پور سے ۷ میل دور) پھر کیتھل ہردوار کے قریب جنگل میں چھپے رہے۔

عدالت میں ہائیکورٹ میں اٹھارہ دن التوا کے بعد یکم اپریل کو مقدمہ کی کارروائی از سرِ نو شروع ہوئی۔ اس روز لدھا رام کی شہادت تھی۔ عدالت کے وسیع صحن میں ہزاروں انسانوں کا اجتماع تھا۔ عدالت میں داخلے کے لیے پاس جاری کیے گئے تھے۔ مگر ہجوم کی زیادتی کے باعث پاس بند کرنے پڑے۔ کمرۂ عدالت سے باہر اور اندر پولیس کا اہم انتظام تھا۔ ٹھیک نو بج کر پنتالیس منٹ پر امیر شریعتؒ کو پولیس کی معیت میں کار پر عدالت میں لایا گیا تو ہجوم اس قدر بے قابو ہوا کہ پولیس کو اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ مقدمہ کی کارروائی ٹھیک دس بجے شروع ہوئی۔

ایڈووکیٹ جنرل مسٹر سلیم نے عدالت سے کہا:

"سابقہ پیشی کے بعد لدھا رام کے نام سمن جاری کیے گئے تھے، لیکن سمنوں کی تعمیل نہیں ہو سکی۔ بہتر کوشش کے بعد بھی پتہ نہیں چل سکا کہ لدھا رام کہاں ہے۔"

اس پر میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ نے عدالت سے کہا:

"میں عدالت سے درخواست کرنا چاہتا ہوں اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ لدھا رام لاہور ہی میں ہے، اور میرے ایک دوست نے کہا ہے کہ لدھا رام کو احاطہ عدالت میں دیکھا گیا ہے۔"

میاں عبدالعزیز کی درخواست پر لدھارام کی تلاش کے لیے عدالت کی کارروائی نصف گھنٹہ ملتوی کر دی گئی۔

دس بج کر پینتیس منٹ پر بھورے رنگ کی ایک کار عدالت کے عین سامنے آکر رکی، جس پر لدھارام سوار تھا۔ پولیس کی خواہش تھی کہ لدھارام کو عدالت میں داخل ہونے سے پیشتر گرفتار کر لیا جائے، لیکن احرار رضاکار چاہتے تھے کہ لدھارام ایک دفعہ عدالت میں چلا جائے اس کشمکش میں کچھ وقت صرف ہوا، آخر کامیابی احرار کارکنوں کو ہوئی۔ اور لدھارام عدالت میں داخل ہو گیا۔

عدالت کی دوبارہ کارروائی دس بج کر پنتالیس منٹ پر شروع ہوئی اور لدھارام کا بیان ہوا۔

چیف جسٹس سٹرینگ کے سوال و جواب کے بعد ایڈووکیٹ جنرل مسٹر سلیم نے عدالت سے گواہ پر جرح کرنے کی اجازت چاہی، جس کے جواب میں لدھارام نے حسب ذیل بیان دیا۔

لدھارام کا بیان

لدھارام قریباً ۲۴ سال کا مضبوط نوجوان ہے۔ اس نے نسواری رنگ کا کوٹ ، چوڑی دار پاجامہ اور گلابی رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں سفید کینوس کے بوٹ تھے اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ جب وہ کمرۂ عدالت میں داخل ہوا، تو بہت سے نعرے بلند ہوئے۔ اس لیے چیف جسٹس کو کہنا پڑا کہ اگر ذرا بھی شور ہوا، تو کمرۂ عدالت وزیٹروں سے خالی کرا دیا جائے گا۔ لدھارام ولد امیر چند نارنگ نے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ میری عمر قریباً چوبیس پچیس سال ہے۔ میں پہلے ملازم تھا اور اب مستعفی ہو چکا ہوں میں انگریزی جانتا ہوں، لیکن بول نہیں سکتا۔

مسٹر سلیم:۔ جب ۲۸ جون کو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے لالہ موسیٰ میں تقریر کی تھی، کیا آپ وہاں موجود تھے؟

لدھارام :۔ پولیس رپورٹر کی حیثیت سے ۔
س ؛ شاہ صاحب نے جو تقریر کی ،کیا آپ نے اس کے نوٹ لیے ؟
ج : جی ہاں! میں نے نوٹ لیے ۔
س ؛ لانگ ہینڈ میں نوٹ لیے یا شارٹ ہینڈ میں؟
ج :۔ ورنیکلر شارٹ ہینڈ میں۔
س : کیا تم نے تمام تقریر کے نوٹ لیے تھے ؟
ج : جو کچھ میں لکھ سکتا تھا لکھا۔
س: کیا تم تمام تقریر لکھ سکتے تھے یا اس کا زیادہ حصہ ؟
ج ؛ میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے جو کچھ سمجھا وہ لکھا۔
س:۔ جو کچھ آپ نے لکھا کیا یہ وہی تھا جو شاہ صاحب نے کہا تھا ؟
ج : (کچھ دیر خاموش رہ کر) جب تک آپ اس سوال کو صاف نہ کریں ،میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔
س : میرا مطلب یہ ہے کہ شاہ صاحب نے جو کچھ کہا تھا کیا وہی آپ نے لکھا تھا؟
ج:۔ جو کچھ میں نے سمجھا کہ شاہ صاحب نے کہا ہے وہی میں نے لکھا۔
س: جب آپ نے یہ نوٹ لکھ لیے، تو کیا آپ نے کسی سے دستخط کرا لیے تھے؟
ج: جی ہاں ،میں نے غلام حسین ، رولدو سنگھ (تیسرا نام ذرا سوچ کر) مقبول حسین شاہ اور فیروز خاں کانسٹیبل کے دستخط کرا لیے تھے ۔
س : کیا اس کے بعد ان شارٹ ہینڈ نوٹوں کے آپ نے اسی وقت لانگ ہینڈ نوٹ بنا لیے ۔
ج :۔ اسی وقت نہیں۔
س:۔ تو کب آپ نے لانگ ہینڈ نوٹ تیار کیے ؟
ج ،۔ گجرات میں پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے گھر آ کر لانگ ہینڈ نوٹ لکھے ،اور اسے

دے دیئے۔

س:۔ کس تاریخ کو لکھے؟

ج:۔ جس دن تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے تھے اس رات اور دن کے بعد۔ میں نے ۲۸۔جون کو لالہ موسیٰ میں نوٹ لیے تھے، رات بھر وہیں رہا۲۹ کو بھی وہیں رہا۔ ۳۰ جون کو پراسیکیوٹنگ کے پیش کیے۔

س: چیف جسٹس:۔ کس جگہ پیش کیے؟

ج: پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر تقریباً دوپہر کے بعد۔

س: یہ لانگ ہینڈ نوٹ علیحدہ کسی کاغذ پر لیے یا اسی نوٹ بک میں جس میں شارٹ ہینڈ نوٹ لیے تھے؟

ج: علیحدہ کاغذ پر لکھ کر اسے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کو دیا۔

س: کیا وہ ترجمہ جو آپ نے شارٹ ہینڈ نوٹ سے لانگ ہینڈ نوٹ میں کیا درست تھا؟

ج: شارٹ ہینڈ نوٹوں کے مطابق لانگ ہینڈ نوٹ بالکل درست تھے۔

س:۔ جس نوٹ بک میں آپ نے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے، اس میں کوئی خالی صفحہ بھی لکھا؟

ج:۔ میں دونوں طرف نوٹ لکھتا گیا۔

س: کیا آپ عام طریقے پر اسی طرح شارٹ ہینڈ نوٹ لیتے تھے؟

ج: عام طور پر دونوں طرف نہیں لکھا جاتا۔ کسی جگہ درمیان میں خالی صفحے چھوڑ دیے جاتے ہیں کسی جگہ نہیں۔

س: آپ کتنے عرصے سے رپورٹنگ کر رہے ہیں؟

مسٹر جسٹس رام لال: آپ یہ سوال کس لیے دریافت کر رہے ہیں؟

مسٹر سلیم:۔ اس لیے کہ اپنے پہلے سوال کا ٹھیک جواب حاصل کروں۔ (یہ کہہ کر آپ نے پھر سوال دہرایا)۔

لدھارام: میں قریباً ایک سال سے رپورٹنگ کر رہا ہوں۔
مسٹر سلیم: کیا تم نے اس سے پہلے بھی کسی جلسے میں نوٹ لیے؟
ج: جی ہاں! میں نے کئی جلسوں میں نوٹ لیے۔
س: جب آپ دوسروں کے نوٹ لیتے تھے تو صفحے کے ایک طرف لکھتے تھے یا دونوں طرف؟
ج: اگر اچھا اور ایسا مقرر ہوتا، جو عام طور پر مشہور ہوتا اور یہ خیال ہوتا کہ وہ ایسی تقریر کرے گا جو قابلِ اعتراض ہو گی، تو جگہ چھوڑ دیتے۔
چیف جسٹس: مسٹر سلیم، آپ سادہ اور مختصر سوال کیوں نہیں کرتے، جس سے سیدھا جواب مل جائے۔
مسٹر سلیم: میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ دوسری تقریروں کے معاملے میں کہیں جگہ چھوڑ لیتے تھے تو اس کا کوئی خاص سبب ہوتا تھا؟
ج: جی ہاں! شارٹ ہینڈ نوٹوں کے ساتھ کئی دفعہ لانگ ہینڈ نوٹوں کے لیے علیحدہ کاغذ چھوڑ دیا جاتا، تاکہ جب مقدمہ پیش ہو تو یادداشت ہو سکے۔
چیف جسٹس: تم جو شارٹ ہینڈ نوٹ ایک صفحے پر لیتے تھے کیا اس کے لانگ ہینڈ نوٹ اس جگہ پر جو خالی چھوڑ دی جاتی تھی آجاتے تھے؟
ج: سارے نہیں آجاتے تھے، بلکہ ہم ضروری حصے لکھ لیتے تھے تاکہ انہیں یاد رکھ سکیں۔
مسٹر سلیم: آپ نے کہا ہے کہ کئی حالتوں میں آپ خالی صفحے چھوڑ دیتے تھے اس کا کیا سبب تھا؟
ج: جب ہمیں پتہ لگ جاتا تھا کہ گورنمنٹ نے مقدمہ چلانے کی اجازت دے دی ہے اب جگہ چھوڑ دیتے تھے۔

لدھارام : جی ہاں ! جو کچھ میں نے شارٹ ہینڈ میں لکھا ہے اس کا ترجمہ سارے کا سارا لانگ ہینڈ نوٹوں میں کیا۔

مسٹر سلیم : کیا یہ وہی شارٹ ہینڈ نوٹ ہیں، جو آپ نے ۲۸۔ جون کو ملزم کی تقریر کے لیے تھے؟

لدھارام : یہ وہ نوٹ ہیں جو میں نے جلسے میں لیے تھے۔

جرح کی اجازت

اس مرحلے پر مسٹر سلیم نے درخواست کی کہ مجھے گواہ پر جرح کرنے کی اجازت دی جائے، کیونکہ گواہ منحرف ہو گیا ہے۔ میاں عبدالعزیز نے اعتراض کیا کہ اس مرحلے پر کوئی وجہ نہیں کہ گواہ کو منحرف قرار دیا جائے۔ کیونکہ یہ ثابت نہیں ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ سچ بول رہا ہے۔ فاضل جج نے فیصلہ کیا کہ ایڈووکیٹ جنرل کو جرح کرنے کا حق ہے۔ میاں عبدالعزیز سے انہوں نے کہا کہ کسی گواہ کے منحرف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، ایک سچے گواہ کو بھی منحرف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اس نے استغاثہ کی مرضی کے مطابق بیان نہیں دیا، خواہ استغاثہ جھوٹا ہے یا سچا۔" مسٹر سلیم نے گواہ پر جرح شروع کی۔

س : یہ شارٹ ہینڈ نوٹ آپ نے کہاں سے لیے؟ جو آپ کہتے ہیں کہ اصلی نوٹ نہیں ہیں؟

ج : میں نے لالہ موسیٰ سے واپسی پر گجرات میں پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر یہ شارٹ ہینڈ نوٹ لکھے جو مجھے دکھائے گئے ہیں۔ ۳۰۔ جون کو جب میں نے یہ نوٹ لکھے تو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر ایک اور آدمی راجہ خاں نائب محرر لالہ موسیٰ پولیس اسٹیشن بھی موجود تھا۔

س : آپ نے ان نوٹوں کو کہیں سے نقل کیا یا کسی نے لکھوائے تھے؟

ج : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر صاحب جو مجھے لکھاتے رہے ہیں، اسی کو شارٹ ہینڈ میں لکھتا گیا۔ میں پہلے لانگ ہینڈ ترجمہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس پہنچا چکا تھا اسی کو دیکھ

کر اس میں تبدیلیاں کر کے وہ مجھے لکھاتے رہے۔

س: کیا ان تبدیلیوں کے متعلق پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے اپنے پاس نوٹ لکھ کر رکھے ہوئے تھے یا وہ زبانی تبدیلیاں کراتے جاتے تھے؟

ج: اس وقت میرے لانگ ہینڈ نوٹس کے علاوہ اور بھی ایک کاغذ تھا لیکن مجھے یہ نہیں دکھایا گیا کہ اس کاغذ پر کیا لکھا ہوا تھا۔ لیکن اتنا نظر آ رہا تھا کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف سے انگریزی کے ٹائپ شدہ حروف نظر آ رہے تھے۔ لکھاتے وقت وہ دوسرے کاغذ کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے۔ شارٹ ہینڈ کے بعد پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر لانگ ہینڈ بک کا ترجمہ بھی لکھا گیا۔ لانگ ہینڈ ترجمہ علیحدہ کاغذ پر بھی لکھا اسی دن پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر نوٹ بک پر لانگ ہینڈ لکھنے کے بعد علیحدہ کاغذ پر لانگ ہینڈ ترجمہ کی نقل کی۔ دوسری دفعہ جب لانگ ہینڈ کی نقل کی گئی تو کاربن پیپر کے ذریعے دو کاپیاں بنائی گئیں۔ ایک اصل اور دو کاربن والی کاپیاں دوسری نوٹ بک پر جو بعد میں تیار کی گئی۔ میرے سامنے گواہوں نے دستخط نہیں کیے اصل نوٹ بک جس میں جلسے کی تقریر کے نوٹ تھے، پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے سامنے میز پر رکھی ہوئی تھی وہ شارٹ ہینڈ نوٹ اور لانگ ہینڈ ترجمہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے سامنے چھوڑ گیا تھا۔

نوٹ بک جلادی گئی

اصلی شارٹ ہینڈ نوٹ بک میرے سامنے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر جلادی گئی، اور اصلی نوٹوں کے لانگ ہینڈ نوٹوں کے ترجمے کو بھی میرے سامنے جلادیا گیا، یہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کا رہائشی مکان تھا۔ میٹنگ سے پہلے ہی مجھے ہدایت دی گئی تھی کہ پیر غازی میں جس تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لینے مقصود ہیں ان نوٹوں کے درمیان وقفے چھوڑ دینا۔ ہدایات کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ پنجاب کے وزیر اعظم کی ایک چٹھی سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کو موصول ہوئی ہے جس میں انہوں نے

لکھا ہے کہ سید عطاءاللہ شاہ بخاری آپ کے علاقے میں آرہا ہے، وہ یونینسٹ پارٹی کے خلاف منافرت پھیلانے آرہا ہے۔ اس کی تقریر اس طریقے پر لی جائے کہ دفعات ۲۔۳۔ ۱۱۷ اور ۱۵۳ کی زد میں آجائے۔ تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لینے پر ایسے شخص کو لگایا جائے جو تعلیم یافتہ ہو، اور گواہ بھی ایسے ہونے چاہئیں جو پولیس کے زیر اثر ہوں؟

ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ:

ایک چٹھی ایسی تھی جس پر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے میرے دستخط کرائے، وہ چٹھی ہدایات سے متعلق تھی اور دستخط اس لیے کرائے تھے کہ میں بعد میں یہ نہ کہہ سکوں کہ ہدایات نہیں ملی تھیں۔ جس خط پر وزیراعظم کی ہدایات تھیں وہ مجھے نہیں دکھایا گیا تھا، پہلی دفعہ مجھے ۲۰۔ جون سے دو تین ہفتے پہلے ہدایات دی گئی تھیں۔ ۲۸۔ جون کو جب میں تقریر کی رپورٹ کے لیے لالہ موسیٰ روانہ ہونے والا تھا تو مجھے بلا کر کہا گیا کہ تقریر کی رپورٹ جلد از جلد لے کر شارٹ ہینڈ نوٹ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس پہنچا دوں۔ جب دو یا تین ہفتے پہلے ہدایات دی گئیں اس وقت مجھے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بلایا تھا۔ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس انگریزی میں بات کرتے تھے۔ تھوڑی بہت انگریزی میری سمجھ میں آتی تھی باقی نہیں آتی تھی۔ پھر پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے ایس۔پی کی موجودگی میں ہدایات دیں کہ پیر غازی (لالہ موسیٰ) میں میٹنگ ہونے والی ہے۔ وہاں سید عطاءاللہ شاہ بخاری تقریر کرنے والے ہیں۔ اس کی تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیتے وقت خالی جگہیں چھوڑتے جانا۔

س : کیا اس وقت آپ کو بتلایا گیا تھا کہ شارٹ ہینڈ نوٹوں میں جگہیں کیوں چھوڑنی ہیں۔

ج : اس وقت تک مجھے نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ جگہیں کیوں چھوڑنی ہیں۔ لیکن یہ بات تو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ جب سپرنٹنڈنٹ پولیس سمجھ چکے تھے تو مجھے ہدایات دی گئیں۔ پیر غازی جو جلسہ ہونے والا ہے اس کے نوٹوں میں خالی جگہ رکھی جائے۔

ایک سوال پر گواہ نے کہا کہ جگہ شارٹ ہینڈ نوٹوں میں چھوڑنی تھی۔

س: کیا یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ جہاں آپ کا خیال ہو جگہ چھوڑ دو، یا کوئی خاص جگہ چھوڑنے کے لیے کہا گیا تھا۔

ج کہیں ایک لائن کہیں دو لائنیں۔

س، میرا سوال یہ ہے، کیا یہ قطعی سہولت دی گئی تھی کہ کس طرح جگہ خالی چھوڑی جائے؟

ج: نہیں! خاص طریقے کی ہدایت نہیں دی گئی تھی۔

س: یہ ہدایات کس کی تقریروں کے متعلق تھیں؟

ج: سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے متعلق۔

س: تقریر کہاں کرنی تھی؟

ج: پیر غازی میں۔

س: کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کو جگہ چھوڑنے کے متعلق کیوں ہدایت کی گئی تھی؟

ج: مجھے پتہ نہیں۔

س: آپ کو پتہ نہیں تھا اور آپ نے کسی سے خیال بھی ظاہر نہیں کیا؟

ج: نہیں۔

س: آپ قیاس بھی نہیں کر سکتے تھے؟

ج: قیاس تو ہر شخص کر سکتا ہے ایک معمولی سا ملازم بھی۔

عدالت سے تحفّظ کی درخواست

س: کیا پہلا موقع تھا جب آپ نے اس طرح خالی جگہ چھوڑی؟

ج: اگر عدالت مجھے تحفّظ دے تو میں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔

چیف جسٹس: آپ کو تحفّظ دیا جاتا ہے، لیکن اگر ہمیں خیال ہوا کہ آپ کا جواب غلط ہے تو مقدمہ چل سکتا ہے، اگر درست ہوا تو نہیں۔

لدھارام، میری عرض یہ ہے کہ میں جن واقعات کے متعلق جواب دوں گا، اس میں مقدمہ چل کر سزا ہو سکتی ہے۔

مسٹر سلیم، مائی لارڈ، میری درخواست ہے کہ یہ کارروائی میں لکھا جائے کہ گواہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس سوال کا جواب دے۔ اس میں سب کچھ آجاتا ہے۔

میاں عبدالعزیز، لیکن اس صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گواہ جواب دینے سے انکار کر دے۔

چیف جسٹس، محض یہ سوال دریافت کیا جائے کہ کیا گواہ کو پہلے بھی یہ ہدایت ملی تھی۔

مسٹر سلیم نے یہی سوال کیا جس کے جواب میں گواہ نے کہا کہ مجھے اس سے پہلے بھی اسی طرح کی ہدایات ملی تھیں۔

مسٹر سلیم: آپ کو ہدایات کب ملی تھیں؟

اس مرحلے پر وکیل صفائی میاں عبدالعزیز نے درخواست کی کہ اس سوال کے جواب میں گواہ کو تحفّظ دیا جائے۔

چیف جسٹس، یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ گواہ پہلے کہہ چکا ہے کہ اسے پہلے بھی ہدایات ملتی رہی ہیں۔

میاں عبدالعزیز، لیکن اس معاملہ میں گواہ کو ضرور تحفّظ ملنا چاہیے۔

چیف جسٹس، صرف اس خاص سوال کے جواب میں تحفّظ دیا جائے گا۔

مسٹر سلیم، (گواہ سے) سید بخاری کے جلسے کے متعلق آپ کو جو ہدایات دی گئی تھیں کیا اس وقت بھی کوئی چٹھی آئی تھی؟

ج: چٹھیاں تو کئی آتی رہتی ہیں۔

مسٹر جسٹس رام لال، کیا اس خاص جلسے کے متعلق کوئی چٹھی دکھائی تھی؟

لدھارام: جی ہاں۔

مسٹر سلیم: اصلی چھٹی دکھائی گئی تھی یا اس کی نقل؟
ج: اس کا ترجمہ، کیونکہ اس پر لکھا ہوا تھا یہ بہت خفیہ ہے۔
ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا۔ میں نے اصلی خط نہیں پڑھا بلکہ نقل جو سپرنٹنڈنٹ پولیس کا ریڈر اپنے رجسٹر میں درج کرتا ہے اوہی پڑھی۔
مسٹر سلیم: رجسٹر میں جو درج تھا اس میں کیا لکھا تھا؟
ج: مجھے یاد نہیں رہا جو کچھ مجھے یاد ہے وہ کہہ چکا ہوں اور وہ یہ کہ جگہ خالی رکھی جائے اور تقریر کے نوٹوں کی ایک کاپی پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کو دی جائے۔
مسٹر جسٹس رام لال: کیا سارا رجسٹر پڑھا تھا یا محض وہ نقل؟
ج: ترجمہ جو کچھ تھا وہ پڑھا، اور اس خط کے نمبر بھی علیحدہ نوٹ کر لیے۔
ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ مستقبل میں اپنی رہنمائی کے لیے لکھا تھا۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ میں نے یہ نقل ریڈر کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی اجازت سے لی تھی۔ اور میں اسی طرح اکثر نقل لیا کرتا تھا۔
چیف جسٹس: آپ نے جس تحریر کی نقل لی تھی وہ بہت تھوڑی تھی یا زیادہ؟
گواہ: کچھ خط تھے جن پر تھوڑی تھوڑی عبارت تھی۔
چیف جسٹس: دس دس سطریں یا بیس بیس سطریں۔ تم نے کتنی دیر میں نقل کیں؟
لدھا رام: تین چار منٹ میں، میں نے پیر غازی کے جلسے کے متعلق ہدایات نقل کیں۔
چیف جسٹس: کیا سپرنٹنڈنٹ پولیس اس وقت موجود تھے؟
گواہ: وہ دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے۔
مسٹر سلیم: مطلب یہ ہوا کہ بعض اوقات نقل کرتے وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس موجود ہوتے تھے اور بعض اوقات نہیں۔
گواہ: کئی اوقات ریڈر کو ہدایت کی جاتی تھی کہ دوسرے کمرے میں لے جائے۔

خفیہ رجسٹر

چیف جسٹس: یہ رجسٹر بہت خفیہ ہے ؟
گواہ: جی ہاں۔
چیف جسٹس، اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو نہیں بتایا جاتا تھا ؟
گواہ: جس کے متعلق ہدایت ہوتی تھی اسے بتادیا جاتا تھا۔
چیف جسٹس: سوال یہ ہے کہ ایک سترہ روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے کانسٹیبل کو سپرنٹنڈنٹ پولیس وہی خفیہ تحریریں کیونکر دکھا سکتے ہیں ؟
گواہ: میں چند اور باتیں بھی اس سلسلے میں بیان کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ وہ کام میں نے کرنا تھا۔
مسٹر سلیم، آپ نے کہا تھا کہ آپ نقل کرتے وقت نمبر بھی نقل کر لیتے تھے۔ یہ کیوں ؟
گواہ، اس کے متعلق نقل کرتے وقت کوئی خیال نہیں ہوتا۔
س: جو نقل آپ کے پاس تھی اس کے متعلق آپ کو ہدایت تھی کہ اسے محفوظ رکھا جائے یا نہیں ؟
ج: اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔
چیف جسٹس، سوال یہ ہے کہ جب تم نقل کر لیتے تھے تو کیا یہ بتلایا جاتا تھا کہ اسے جس طرح چاہو استعمال کرو، اسے اپنے پاس رکھو یا نہیں ؟
میاں عبدالعزیز: (ڈانٹ کر) اس وقت گواہ ان کے اعتماد میں تھا۔
گواہ: جو کچھ میرے متعلق لکھا ہوتا تھا، اس کے متعلق ہدایت ہوتی تھی کہ اپنی یادداشت کے لیے نقل کر لو۔
س: جب آپ کو چٹھی دکھائی جاتی تھی یا ہدایت دی جاتی تھی، تو ہمیشہ اس کی نقل دی جاتی تھی ؟
ج: میں ہمیشہ نقل کر لیتا تھا۔ ایک اور سوال پر گواہ نے کہا کہ میں نقل اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور محفوظ رکھتا تھا۔

لکڑی کا بکس

مسٹر سلیم: تو ہم فرض کرتے ہیں کہ کئی مقدمات کے متعلق بھی ہدایات کی نقلیں آپ کے پاس ہوں گی؟

ج: جی ہاں! میرے پاس پولیس اسٹیشن گجرات میں ہیں جنہیں میں اپنے رہائشی کوارٹر میں اپنے ایک صندوق میں چھوڑ آیا ہوں۔

چیف جسٹس: اسے تالا لگایا تھا؟

گواہ: تالا لگایا تھا، مگر وہ پہلے سے ہی خراب تھا۔ قریباً تین چار ماہ پہلے سے۔

چیف جسٹس: کیا ان کاغذات کو خفیہ رکھنے کے لیے بکس ملا تھا؟

گواہ: جی ہاں۔

گواہ نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ اس صندوق میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا بکس تھا، جس میں وہ کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ اس کی چابی ابھی تک میرے پاس ہے۔

چیف جسٹس: لاؤ دیکھیں۔

لدھارام، نے اپنی جیبیں ٹٹولنے کے بعد کہا کہ "میں نے اپنی تمام چابیاں اپنے ایک دوست خواجہ کو دی ہوئی ہیں، وہ یہیں موجود تھے۔" اس کے بعد خواجہ کو (جس کا پہلا نام گواہ نہیں جانتا تھا) بلایا گیا۔ اس نے چابیاں گواہ کو دیں۔ گواہ نے چابیاں چیف جسٹس کو دے دیں اور اس بکس کی چابی بتائی۔ گواہ نے یہ بھی بتایا کہ خواجہ سے میری گذشتہ پندرہ بیس دن کی واقفیت ہے۔ مزید کہا کہ جلال الدین ہیڈ کانسٹیبل کے پاس بھی اس بکس کی اسی طرح کی چابی ہے۔ اس کے بعد گواہ کو کچھ دستاویزات دکھائی گئیں۔ انہیں دیکھ کر گواہ نے ایک پیرا دیکھ کر کہا کہ یہ پیرا میں نے رجسٹر سے نقل کیا تھا۔

مسٹر سلیم: اس سے پہلے جو سی۔ آر۔ پی لکھا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

گواہ: مجھے معلوم نہیں۔

چیف جسٹس ، شاید اس کا مطلب کانفیڈنیشل رپورٹ آف پولیس ہے۔

خفیہ جھوٹ

مسٹر سلیم ، کسی پر سی ایل پی لکھا ہوتا ہے۔
چیف جسٹس ، (ازراہ مذاق) کانفیڈنیشل لائز (جھوٹ) ہوسکتا ہے (قہقہہ)

اس مرحلے پر چیف جسٹس نے میاں عبدالعزیز سے کہا کہ "کہ آپ اپنی جرح میں اس بات کو ضرور معاف کیجئے کہ اس قدر خطرناک اور کانفیڈنیشل ہدایات کو ایک سترہ روپے کے کانسٹیبل کو نقل کر کے ساتھ لے جانے کی اجازت کس طرح دی گئی۔ ہمیں اس کا یقین نہیں ہوتا۔"

میاں عبدالعزیز : نے کہا، "مائی لارڈ! میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔"

گواہ نے مسٹر سلیم کی مزید جرح کے جواب میں کہا کہ ،

"۲۸ جون کو میں ہدایت حاصل کر کے پیر غازی والی تقریر کے نوٹ لینے گیا تھا۔ ہدایات مجھے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے گجرات میں دی تھیں۔ ایس۔ پی اپنے کمرہ میں ہوگا۔ لیکن اس وقت ہم دونوں کے سوائے کوئی وہاں موجود نہ تھا۔ اس وقت مجھے یہی ہدایات دی گئی تھیں کہ تقریر کے نوٹ لیتے ہی پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس واپس آنا۔ اس کے علاوہ اس دن مزید ہدایات نہیں دی گئی تھیں۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ تقریر FABRICATE ہوگی۔ کیونکہ ایسی باتیں تو قیافہ سے ہی معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے مجھے کہا جا چکا تھا کہ جگہ خالی چھوڑوں یا نہ چھوڑوں۔ مجھے محض یہ ہدایت تھی کہ جس وقت نوٹ لے آؤں فوراً پراسیکیوٹنگ افسر کے مکان پر پہنچ جاؤں۔

مسٹر سلیم : اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو یہ ہدایت نہیں کی گئی تھی جس سے یہ معلوم ہو کہ اس میں بناوٹ کی جائے گی ؟

ج : مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ اس میں بناوٹ کی جائے گی۔

س : کیا آپ کو شبہ تھا یا بتایا گیا تھا؟

ج : ایسی باتیں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں، مجھے بتایا نہیں گیا تھا۔

س : کیا اس تقریر کے متعلق خاص ہدایت کی گئی تھی؟

ج : مجھے فون پر بلا کر ہدایت کی گئی تھی کہ لانگ ہینڈ نوٹ نہ کرنا۔

س : کیا یہ بتایا گیا تھا کہ کوئی خالی جگہ نہ چھوڑنا؟

ج : مجھے نہیں بتایا گیا تھا۔

س : جس نوٹ بک میں آپ نے نوٹ لیے وہ گجرات سے لی تھی؟ — جب آپ
لالہ موسیٰ گئے تھے کیا آپ کو خیال تھا کہ نوٹ بک جلائی جائے گی؟

س : کیا آپ کو یہ ہدایات دی گئیں کہ فوراً آ جائیں؟

ج : مجھے یہ ہدایت تھی کہ جتنی جلدی فارغ ہو جاؤ واپس آ جانا۔

س : کب فارغ ہو گئے تھے؟

ج : اور بھی کئی تقریریں تھیں - شہزادہ آزاد نے بھی تقریر کی تھی اس لیے دوسرے دن شام
کو فارغ ہوا۔

س : ۲۸ - جون کی شام کو آپ نے کس وقت تقریر کے نوٹ لیے؟

ج : مجھے یاد نہیں — ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ غالباً دونوں شہروں میں دس
گیارہ میل کا فاصلہ ہے۔

س : کیا جس رات نوٹ لیے تھے اس رات سوئے بھی تھے؟

ج : جی ہاں! میں تھانہ لالہ موسیٰ میں سویا تھا - وہاں اور سپاہی بھی تھے، جنہوں نے مجھے کہا
تھا کہ شاید کل جلسہ ہو، اس لیے مجھے لالہ موسیٰ ہی میں ٹھہرنا چاہیے (اس مرحلے پر کارروائی
لنچ کے لیے ملتوی ہو گئی)

لنچ کے بعد کارروائی شروع ہوئی تو مسٹر سلیم نے جرح جاری رکھتے ہوئے لدھارام سے پوچھا:

س : ۲۸-جون کے جلسے میں جس میں عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریر کی، کیا آپ نے کسی دوسری تقریر کے نوٹ لیے ؟

گواہ : جی ہاں ! میں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے علاوہ ایک دو اور اصحاب کی تقریروں کے نوٹ لیے جن کے نام مجھے یاد نہیں۔

س : جب آپ نے نوٹ لیے اس وقت دن کچھ باقی تھا ؟

ج : نہیں، جلسہ رات نو بجے کے بعد شروع ہوا۔

س : کیا ان تقریروں کے نوٹ اسی نوٹ بک میں لیے تھے ؟

ج : جی ہاں۔

س : کیا آپ نے دوسرے دن یعنی ۲۹-جون کو کسی اور تقریر کے نوٹ لیے تھے ؟

ج : نہیں۔

مسٹر جسٹس رام لال : کیا اس دن لالہ موسیٰ میں کوئی جلسہ تھا ؟

ج : ایک جلسہ تھا مگر اسے ملتوی کر دیا گیا تھا۔

مسٹر سلیم : آپ لالہ موسیٰ سے گجرات کب گئے ؟

ج : ۲۹-جون کی شام یا ۳۰-جون کی صبح، لیکن مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ کیونکہ اس واقعے کو آٹھ، نو ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔

س : آپ نے پہلے کہا تھا کہ آپ کو ہدایت ہوئی تھی کہ تقریریں نوٹ کرنے کے بعد فوراً پہنچو، تو کیا آپ کو یاد نہیں کہ ۲۹-جون کی شام کو گئے یا ۳۰-جون کی صبح کو ؟

گواہ : مجھے یاد نہیں۔ لیکن یہ یاد ہے کہ ۳۰-جون کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس گیا تھا۔

مسٹر سلیم : اگر آپ ۲۹-جون رات کو گجرات جاتے تو کہاں رہتے ؟

ج : گجرات جاتا تو تھانہ میں رپورٹ دے کر وہیں رہتا۔

س : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس کس وقت گئے ؟

ج : دوپہر کے بارہ بجنے کے بعد، مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ غالباً تین اور چار بجے کے درمیان گیا ہوں گا۔

س : جب آپ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر سے ملے تو کیا نوٹ بک جس میں آپ نے ان تقریروں کے نوٹ لیے تھے، وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے اور اسے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے حوالے کر دیا تھا؟

ج : جی ہاں!

س : جب آپ نے نوٹ بک حوالے کی، تو کیا شارٹ ہینڈ نوٹ پڑھ کر سنائے تھے یا لانگ ہینڈ میں لکھ کر؟

ج : میں نے لانگ ہینڈ نوٹ بنائے اور اس کے بعد انہیں انسپکٹر کو پیش کر دیا۔

س : کیا ان کی موجودگی میں لانگ ہینڈ نوٹ تیار کیے؟

ج : جی ہاں، پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کی موجودگی میں تیار کیے۔

س، جب آپ نے لانگ ہینڈ نوٹ بنائے تو کیا آپ کی موجودگی میں انہوں نے پڑھا؟

ج : جی ہاں۔

س : کیا انہوں نے پڑھنے کے بعد کہا کہ یہ تسلی بخش نہیں ہے یا ہے؟

ج : انہوں نے کہا کہ جو کچھ میں بولوں، اس کے نئے سرے سے شارٹ ہینڈ نوٹ لکھو۔
ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے میرے لانگ ہینڈ نوٹ دو تین مرتبہ پڑھے اور اس کے بعد لکھانا شروع کیا۔

س، آپ نے جو نوٹ لکھے ان میں کتنا عرصہ لگا؟

ج : تقریباً چھ سات گھنٹے — ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ شارٹ ہینڈ نوٹ لکھوانے اور لانگ ہینڈ نوٹ بنوانے کے لیے پہلے شارٹ ہینڈ نوٹ بک جلائی گئی تو دوسری تقریروں کے متعلق کیا ہوا؟ گواہ نے کہا کہ اگر کورٹ مجھے تحفظ دے تو میں جواب

دے سکتا ہوں۔ کیونکہ ان کے سلسلے میں عدالت فیصلہ دے چکی ہے۔

میاں عبدالعزیز: دوسرے مقدمے میں جو شہزادہ آزاد کے خلاف ہوا گواہ پر جرح ہونی ہے، اس لیے گواہ کی درخواست ہے کہ اگر وہ اس کے متعلق میاں جو بھی بیان دے گا وہ اس کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس پر گواہ نے کہا کہ جو شہادت میں نے جہلم میں شہزادہ آزاد کے خلاف دی تھی وہ پراسیکیوٹنگ افسر کے کہنے پر دی تھی۔

مسٹر سلیم: سوال یہ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ دوسری تقریروں کے نوٹوں کے متعلق کیا کیا گیا؟

گواہ: ان پر دستخط بھی تھے۔

چیف جسٹس: سوال یہ ہے کہ اس نوٹ بک میں دوسری تقریروں کے نوٹ بھی تھے۔ جب اس نوٹ بک کو جلا دیا گیا تو ان تقریروں کے نوٹوں کا کیا بنا؟

گواہ: انہیں بھی دوبارہ لیا گیا، اسی لیے تو سات گھنٹے صرف ہوئے تھے۔

مسٹر سلیم: جب آپ سید صاحب کی تقریر کے نوٹوں کا ذکر کر رہے تھے، تو دوسری تقریروں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

گواہ: اسی لیے کہ میں پروٹیکشن لینے کے بعد ہی کروں گا۔

س: جو جو تقریریں ہوئیں کیا ان سب کو دوبارہ نوٹ بک میں لیا گیا تھا؟

گواہ: جی ہاں۔

س: جب آپ نے ان تقریروں کو دوبارہ کر لیا تو کیا انہیں اصل کے مطابق لیا یا ان میں بھی تبدیلی کرائی گئی؟

گواہ: اگر مجھے یقین دلایا جائے کہ اس بیان پر میرے خلاف مقدمہ نہیں چلے گا تو میں بتا سکتا ہوں۔

میاں عبدالعزیز: یہ حفاظت تو پہلے دی جا چکی ہے۔

گواہ : کچھ لفظ سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے نکال کر شہزادہ آزاد کی تقریروں میں ڈال دیے گئے تھے۔

چیف جسٹس : تاکہ شہزادہ آزاد کو سزا ہو جاتے ۔ تو کیوں یہ لفظ ان کی تقریریں ڈالے گئے ؟

گواہ : اس لیے کہ اگر ساری تقریر کو بنایا جاتا تو یہ خیال ہوتا کہ بناوٹی ہے۔ شہزادہ آزاد کی تقریریں یہ الفاظ کہ "ٹوانوں نے ہزاروں روپوں کے کتنے خریدے" نکال کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے نوٹوں میں ڈال دیے گئے ۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا، کہ اس ڈائری میں جو جعلی بنائی گئی، اگر سارے قابل اعتراض الفاظ ڈالے جاتے تو معلوم ہوتا کہ ساری جعلی ہے، اس لیے وزارت کے متعلق بھی کچھ حصہ ملا دیا گیا۔ کیونکہ خط میں لکھا ہوا تھا کہ سید عطاء اللہ شاہ یونینسٹ پارٹی کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہے۔

مسٹر سلیم : آپ کا یہ خیال ہے کہ ایک تقریر کے چند حصے دوسری تقریریں ڈالے گئے تاکہ یہ معلوم نہ ہو کہ ساری تقریر جعلی ہے۔

گواہ : جعلی نظر نہ آتے اور دوسرے یہ کارکردگی دکھانے کے لیے کہ میں یونینسٹ وزارت کا اتنا ہمدرد ہوں۔

چیف جسٹس : وہ الفاظ جو شہزادہ آزاد کی تقریر سے نکال کر سید عطاء اللہ شاہ کی تقریریں ڈالے گئے وہ قابلِ اعتراض تھے یا نہیں ؟

گواہ : ہو سکتا ہے۔

چیف جسٹس : جو الفاظ سید صاحب کی تقریر سے نکال کر آزاد کی تقریریں ڈالے گئے وہ قابلِ اعتراض تھے یا نہیں ؟

گواہ : ہوں گے، مجھے پتہ نہیں۔

چیف جسٹس : کیا آپ کے خیال میں دونوں نے قابلِ اعتراض تقریریں کی تھیں ؟

گواہ : نہیں

چیف جسٹس : ہوسکتا ہے تمام تقریریں قابلِ اعتراض نہ ہوں، چند الفاظ ہی قابلِ اعتراض ہوں؟

گواہ : جہاں تک میرا خیال ہے نہیں۔

چیف جسٹس : اگر نہیں تو ایک تقریر کے الفاظ دوسرے کی تقریر کے الفاظ میں کیوں ڈالے گئے؟

گواہ : ایک آدھ لفظ ایک تقریر سے لیا جاتا تھا اور کچھ اپنے پاس سے ملالیا جاتا تھا۔

مسٹر جسٹس رام لال : یعنی پورے جملے نہیں، بلکہ چند الفاظ ہی ملائے جاتے تھے؟

گواہ : جی ہاں۔

مسٹر سلیم : آپ نے کہا تھا یہ دستخط جو اس کے نیچے ہیں آپ کی موجودگی میں نہیں کیے گئے
تو پھر کس نے کیے تھے؟

گواہ : یہ ان لوگوں کے دستخط تھے جو میں نے بتائے ہیں یا پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے کہنے
پر مقبول حسین شاہ کو بلوایا گیا تھا، اس نے اپنے دستخط کیے اور دوسرے فیروز خاں کے
نام پر اس نے خود دستخط کیے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کون سے دستخط کیے تھے،
لیکن یہ یاد ہے کہ دونوں میں سے ایک میں نے کیے۔

مسٹر سلیم : فیروز خاں کو کیوں نہیں بلایا گیا؟

گواہ : وہ مل نہیں سکا تھا۔

س : مقبول حسین کب آیا؟

ج : جس دن یہ نوٹ تیار کیے گئے اس کے تین چار دن بعد گجرات سے آیا تھا۔

س : اس دوران میں یہ مبیّنہ جعلی ڈائری کس کے پاس رہی؟

ج : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس۔

مسٹر جسٹس رام لال : آپ کو کب واپس ملی؟

گواہ : دس پندرہ دن کے بعد۔

چیف جسٹس : جب آپ کو پہلی دفعہ جعلی دستاویز کے لیے کہا گیا تو کیا آپ نے پروٹسٹ کیا ؟
گواہ : جی ہاں! میں نے پروٹسٹ کیا تھا، لیکن میرے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا، جس نے ایک دفعہ غلطی کی تھی تو اسے معطل کر دیا گیا تھا۔

خودکشی کا ارادہ

چیف جسٹس : کیا تم نے درخواست میں کہا تھا کہ میں جھوٹی شہادت دینا نہیں چاہتا؟
گواہ : اگر میں لکھتا تو نہ معلوم مجھے کیا دھکے کھانے پڑتے، اور نہ معلوم پولیس مجھ سے کیا سلوک کرتی —— اس مرحلے پر مسٹر سلیم نے ایک سوال دریافت کرنا چاہا، جس پر لدھا رام نے کہا کہ میری ایک اور درخواست بھی ہے، میں تہیہ کیے ہوئے تھا کہ شہادت دینے کے بعد خودکشی کروں گا۔ اس کے لیے میں نے سنکھیا خریدا۔ آپ بے شک اس دکان سے دریافت کر سکتے ہیں۔ میرے والد، میری والدہ اور گھر کے تمام آدمیوں کو اس کا علم ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میرے دل میں کیا تھا۔
مسٹر سلیم : یہ تو معمولی بات تھی کہ جھوٹی شہادت نہ دو اور خودکشی نہ کرو۔
گواہ : جی ہاں، بات معمولی تھی۔ لیکن مجھے پتہ تھا کہ اگر وہاں آواز پہنچاتا تو اس عدالت میں بھی جہاں میری آواز پہنچ رہی ہے پہنچ نہ سکتی۔
مسٹر جسٹس رام لال : یہ پولیٹیکل پلیٹ فارم نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر تمہارا ضمیر بیدار تھا تو تم نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا کہ سچ بولوں گا؟
گواہ : اس لیے تو میں اب سچ بولنے پر مجبور ہوا ہوں۔
میاں عبدالعزیز : پوزیشن یہ ہے کہ اس وقت پروٹسٹ نہیں کیا، کیوں کہ پیٹ کا فکر تھا۔ ماتحت عدالت میں مشکل تھا، اس لیے اب عدالت بالا میں اسے ہمت ہو گئی کہ سچ بولے۔
مسٹر سلیم ، نے گواہ پر جرح جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نوٹ بک میں جو آپ کے

حیاتِ امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ

گذشتہ ربع صدی کی سیاسی اور مذہبی تحریکات کے

پس منظر میں

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ

کی پہلی مکمل اور مستند

سوانح حیات